ثانوی زبان کی معاون درسی کتاب

سَب رنگ

دسویں جماعت کے لیے

حصہ 5

1004

विद्यया ऽमृतमश्नुते

एन सी ई आर टी

NCERT

نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

NATIONAL COUNCIL OF EDUCATIONAL RESEARCH AND TRAINING

© NCERT not to be republished

Sub Rang, Urdu S/R
Textbook for Class X

ISBN 978-93-5007-152-6

جُملہ حقوق محفوظ

- ناشر کی پہلے سے اجازت حاصل کیے بغیر، اس کتاب کے کسی بھی حصے کو دوبارہ پیش کرنا، یادداشت کے ذریعے بازیافت کے سسٹم میں اس کو محفوظ کرنا یا برقیاتی، میکانیکی، فوٹو کاپینگ، ریکارڈنگ کے کسی بھی وسیلے سے اس کی ترسیل کرنا منع ہے۔
- اس کتاب کو اس شرط کے ساتھ فروخت کیا جارہا ہے کہ اسے ناشر کی اجازت کے بغیر، اس شکل کے علاوہ جس میں کہ یہ چھاپی گئی ہے یعنی، اس کی موجودہ جلد بندی اور سرورق میں تبدیلی کرکے، تجارت کے طور پر نہ تو مستعار دیا جاسکتا ہے، نہ دوبارہ فروخت کیا جاسکتا ہے، نہ کرایہ پر دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی تلف کیا جاسکتا ہے۔
- کتاب کے صفحہ پر جو قیمت درج ہے وہ اس کتاب کی صحیح قیمت ہے۔ کوئی بھی نظرثانی شدہ قیمت چاہے وہ ربر کی مہر کے ذریعے یا چپکی یا کسی اور ذریعے ظاہر کی جائے تو وہ غلط متصوّر ہوگی اور ناقابل قبول ہوگی۔

این سی ای آر ٹی کے پبلی کیشن ڈپارٹمنٹ کے دفاتر

این سی ای آر ٹی کیمپس
شری اروندو مارگ
نئی دہلی - 110016 **فون** 011-26562708

108,100 فٹ روڈ ہوسڈے کیرے ہیلی
ایکسٹینشن بناشنکری III اسٹیج
بینگلورو-560085 **فون** 080-26725740

نوجیون ٹرسٹ بھون
ڈاک گھر، نوجیون
احمد آباد - 380014 **فون** 079-27541446

سی ڈبلیو سی کیمپس
بمقابل ڈھانکل بس اسٹاپ، پانی ہاٹی
کولکاتا - 700114 **فون** 033-25530454

سی ڈبلیو سی کامپلیکس
مالی گاؤں
گواہاٹی - 781021 **فون** 0361-2674869

اشاعتی ٹیم

ہیڈ، پبلی کیشن ڈویژن : انوپ کمار راجپوت
چیف ایڈیٹر : شویتا اُپّل
چیف پروڈکشن آفیسر : ارون چتکارا
چیف بزنس منیجر (انچارج) : وپن کمار دیوان
ایڈیٹر : سید پرویز احمد
پروڈکشن اسسٹنٹ : سنیل کمار

سرورق
اروپ گپتا

پہلا ایڈیشن

مارچ 2011 چیتر 1933

دیگر طباعت

اپریل 2019 چیتر 1941
فروری 2021 پھالگن 1942

PD 1T SPA

© نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، 2011

قیمت : ₹80.00

این سی ای آر ٹی واٹر مارک 80 جی ایس ایم کاغذ پر شائع شدہ

سکریٹری، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، شری اروندو مارگ، نئی دہلی نے سرسوتی آرٹ پرنٹرس، ای-25، سیکٹر-4، بوانا انڈسٹریل ایریا، دہلی-110039 میں چھپوا کر پبلی کیشن ڈویژن سے شائع کیا۔

© NCERT not to be republished

پیش لفظ

'قومی درسیات کا خاکہ، 2005' میں سفارش کی گئی ہے کہ بچّوں کی اسکولی زندگی، ان کی باہر کی زندگی سے ہم آہنگ ہونی چاہیے۔ یہ زاویۂ نظر کتابی علم کی اُس روایت کی نفی کرتا ہے جس کے باعث آج تک ہمارے نظام میں اسکول، گھر اور سماج کے درمیان فاصلے حائل رہے ہیں۔ نئے قومی درسیات پر مبنی نصاب اور درسی کتابوں کی تیاری اسی بنیادی مقصد پر عمل آوری کی ایک کوشش کہی جاسکتی ہے۔ اس کوشش میں مختلف مضامین کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے اور رٹ کر پڑھنے کے طریقۂ کار کی حوصلہ شکنی بھی شامل ہے۔ ہمیں امّید ہے کہ ان اقدامات سے قومی تعلیمی پالیسی (1986) میں مذکور تعلیم کے 'طفل مرکوز نظام' کی طرف مزید پیش رفت ہوگی۔

اس کوشش کی کامیابی کا انحصار ان اقدامات پر ہے کہ اسکولوں کے پرنسپل اور اساتذہ اپنے تاثرات خود ظاہر کرنے اور ذہنی سرگرمیوں اور سوالوں کے ذریعے سیکھنے کے سلسلے میں بچّوں کی ہمّت افزائی کریں۔ ہمیں یہ ضرور تسلیم کرنا چاہیے کہ بچّوں کو اگر موقع، وقت اور آزادی دی جائے تو وہ بڑوں سے حاصل شدہ معلومات کی بنیاد پر نئی معلومات مرتب کرتے ہیں۔ آموزش کے دوسرے ذرائع اور محلِ وقوع کو نظر انداز کرنے کے بنیادی اسباب میں سے ایک اہم سبب، مجوّزہ نصابی کتاب کو امتحان کے لیے واحد ذریعہ بنانا ہے۔ بچّوں کے اندر تخلیقی صلاحیت اور پیش قدمی کے رجحان کو فروغ دینا اُسی وقت ممکن ہے جب ہم آموزشی عمل میں بچّوں کو بہ حیثیت شریک کار قبول کریں اور ان سے اُسی طرح پیش آئیں۔ انھیں محض مقرّرہ معلومات کا جانکار نہ سمجھیں۔

یہ مقاصد اسکول کے نظام الاوقات (Time -Table) اور طریقۂ کار میں معقول تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ روزمرّہ معمولات میں نرمی کی اتنی ہی اہمیت یا ضرورت ہے جتنی کہ سالانہ کیلینڈر کے

نفاذ اور محنت کی تا کہ تدریس کے لیے دستیاب مدّت کو حقیقتاً تدریس کے لیے وقف کیا جا سکے۔ تدریس اور اندازِ قدر کے طریقوں سے بھی اس امر کا تعین ہوگا کہ یہ درسی کتاب بچّوں میں ذہنی تناؤ اور اکتاہٹ پیدا کرنے کے بجائے ان کی اسکولی زندگی کو خوش گوار بنانے میں کس حد تک موثر ثابت ہوتی ہے۔ نصابی بوجھ کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے نصاب سازوں نے مختلف سطحوں پر معلومات کی تشکیل نو اور اُسے نیا رخ دینے کی غرض سے بچّوں کی نفسیات اور تدریس کے لیے دستیاب وقت پر زیادہ سنجیدگی کے ساتھ توجّہ دی ہے۔ اس مخلصانہ کوشش کو مزید بہتر بنانے کے لیے یہ درسی کتاب سوچنے اور حیرتوں کو جگائے رکھنے، چھوٹے گروپوں میں بحث ومباحثہ کو فروغ دینے اور عملاً انجام دی جانے والی سرگرمیوں کو زیادہ اوّلیت دیتی ہے۔

این سی ای آر ٹی اس کتاب کے لیے تشکیل دی جانے والی ''کمیٹی برائے درسی کتاب'' کی مخلصانہ کوششوں کی شکر گزار ہے۔ کونسل زبانوں کی مشاورتی کمیٹی برائے زبان کے چیئرمین پروفیسر نامور سنگھ اور اس کتاب کے خصوصی صلاح کار پروفیسر شمیم حنفی کی ممنون ہے۔ اس درسی کتاب کی تیاری میں جن اساتذہ نے حصّہ لیا، ہم ان کے متعلقہ اداروں کے بھی شکر گزار ہیں۔ ہم ان سبھی اداروں اور تنظیموں کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنے وسائل، مآخذ اور عملے کی فراہمی میں فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ ہم وزارت برائے فروغ انسانی وسائل، حکومتِ ہند کے شعبے برائے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم کی جانب سے پروفیسر مرنال مری اور پروفیسر جی۔ پی۔ دیش پانڈے کی سربراہی میں تشکیل شدہ نگراں کمیٹی (مانیٹرنگ کمیٹی) کے اراکین کا بھی خصوصی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنا قیمتی وقت اور تعاون ہمیں دیا۔ باضابطہ اصلاح اور اپنی اشاعت کے معیار کو مسلسل بہتر بنانے کے مقصد کی پابند ایک تنظیم کے طور پر این سی ای آر ٹی تمام مشوروں اور آرا کا خیر مقدم کرتی ہے تا کہ کتاب کو مزید غور وفکر کے بعد اور زیادہ کارآمد اور بامعنی بنایا جا سکے۔

نئی دہلی
مارچ 2011

ڈائریکٹر
نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

اس کتاب کے بارے میں

جدید ہندوستانی زبانوں میں اردو کو خاص مقام حاصل ہے۔ یہ زبان ملک کی مختلف ریاستوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ سہ لسانی فارمولے کے تحت بھی اردو کی تعلیم پر توجہ دی جاتی ہے۔

کونسل کے ذریعے تیار کردہ 'قومی درسیات کا خاکہ، 2005' کی سفارشات کی روشنی میں مادری زبان کی تعلیم کے لیے پہلی جماعت سے بارھویں جماعت تک اردو میں درسی اور معاون درسی کتب پہلے ہی مہیّا کی جا چکی ہیں۔ ثانوی زبان کی تعلیم کے لیے چھٹی سے دسویں جماعت تک اور تیسری زبان کے لیے ساتویں سے دسویں تک کے لیے درسی کتب شائع ہو چکی ہیں۔ کونسل نے طلبا میں پڑھنے کی صلاحیتوں میں مزید اضافے کے پیش نظر نویں اور دسویں جماعتوں کے لیے معاون درسی کتب تیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور یہ طے کیا گیا ہے کہ نویں جماعت کی معاون درسی کتاب شعری اصناف پر اور دسویں جماعت کی معاون درسی کتاب نثری اصناف پر مشتمل ہوگی۔

یہ معاون درسی کتاب 'سَب رنگ' دسویں جماعت کے طلبا کے لیے تیار کی گئی ہے۔ امّید کی جاتی ہے کہ اس کے مطالعے سے طلبا میں اردو پڑھنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوگا اور وہ مختلف اصناف سے متعارف ہو سکیں گے۔

© NCERT not to be republished

اظہارِ تشکّر

اس کتاب میں پطرس بخاری کا انشائیہ 'سنیما کا عشق'، کرشن چندر کی کہانی 'مینڈک کی گرفتاری'، ابراہیم یوسف کا ڈرامہ 'ٹیپو سلطان' اور قاضی عبدالغفّار کا خاکہ 'حکیم اجمل خاں' شامل ہے۔ کونسل ان سبھی ادیبوں کے وارثین کی شکر گزار ہے۔

اس کتاب کی تیاری میں ڈی ٹی پی آپریٹر ساجد خلیل فلاحی، فرّخ فاطمہ، ابوالحسن، ابوطلحہ اور کمپیوٹر انچارج پرش رام کوشک نے پوری دل چسپی کے ساتھ حصّہ لیا ہے۔ کونسل ان سب کا شکریہ ادا کرتی ہے۔

© NCERT not to be republished

کمیٹی برائے درسی کتاب

چیئرمین، مشاورتی کمیٹی برائے زبان

نامور سنگھ، پروفیسر ایمریٹس، ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

خصوصی صلاح کار

شمیم حنفی، پروفیسر ایمریٹس، شعبۂ اردو، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی

چیف کوآرڈی نیٹر

رام جنم شرما، پروفیسر اور ہیڈ، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن ان لینگویجیز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

اراکین

آفتاب احمد آفاقی، اسسٹینٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی، اتّر پردیش

اِبنِ کنول، پروفیسر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ارشد عبدالحمید، لکچرر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ پی جی کالج، ٹونک، راجستھان

اقبال مسعود، جوائنٹ سکریٹری، ایم پی اردو اکیڈمی، بھوپال، مدھیہ پردیش

انور پاشا، ایسوسی ایٹ پروفیسر، ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

بلال رفیق شاہ، ایسوسی ایٹ پروفیسر، کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، برزولا، سری نگر

حدیث انصاری، صدر، شعبۂ اردو، اسلامیہ کریمیہ پی جی کالج، مدھیہ پردیش

حمید سہروردی، ریٹائرڈ پروفیسر، گلبرگہ، کرناٹک

حیات غنی خاں، اردو ٹیچر، گورنمنٹ گرلز اَپر پرائمری اسکول، اَندرکوٹ، اجمیر، راجستھان

© NCERT not to be republished

خالد سیف اللہ، اسسٹینٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، اتر پردیش

خان شاہد وہاب، ٹی جی ٹی، اردو، گورنمنٹ بوائز سینئر سیکنڈری اسکول، نور نگر، نئی دہلی

خواجہ محمد اکرام الدین، ایسوسی ایٹ پروفیسر، ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

راجیش مشرا، ایسوسی ایٹ پروفیسر، ڈی، ای، ایس، ایس ایچ، آر آئی ای، اجمیر، راجستھان

سادات خاں، اسسٹینٹ ریجنل ڈائریکٹر، بھوپال ریجنل سینٹر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، بھوپال، مدھیہ پردیش

سہیل احمد چشتی، ٹی جی ٹی، اردو، ڈی ایم اسکول، آر آئی ای، اجمیر، راجستھان

سیّد رضا حیدر، ریسرچ آفیسر، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

سیّد محمد ہاشم، پروفیسر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، اتر پردیش

سید یحییٰ نشیط، ریٹائرڈ پرنسپل، وسنت راؤ نائک اردو ہائی اسکول، گل گاؤں، مہاراشٹر

شاہد الحق چشتی، لکچرر، اردو، گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول، کشن گڑھ، اجمیر، راجستھان

شاہد پرویز، ریجنل ڈائرکٹر، دہلی ریجنل سینٹر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، نئی دہلی

شاہدہ پروین، پی جی ٹی، اردو، جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول، جامعہ نگر، نئی دہلی

شعیب رضا خاں، اردو، آفیسر، این آئی او ایس، نوئیڈا، اتر پردیش

شمیم احمد، اسسٹینٹ پروفیسر، شعبۂ اردو اور فارسی، سینٹ اسٹیفنس کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

شہزاد انجم، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی

صغرا مہدی، ریٹائرڈ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی

صغیر اختر، ٹی جی ٹی، اردو، مظہر الاسلام سینئر سیکنڈری اسکول، فراش خانہ، دہلی

ضیاء الرحمٰن صدیقی، ایسوسی ایٹ پروفیسر، اردو ٹیچر ریسرچ سینٹر، سولن، اتراکھنڈ

طارق سعید، صدر، شعبۂ اردو، ساکیت پی جی کالج، اودھ یونیورسٹی، فیض آباد، اتر پردیش

ظہیر رحمتی، اسسٹینٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ذاکر حسین، پی جی ایوننگ کالج، نئی دہلی

© NCERT not to be republished

عارف حسن خاں، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ہندو کالج، مرادآباد، اتر پردیش
عارف عثمانی، ٹی جی ٹی، اردو، اینگلو عربک سینئر سیکنڈری اسکول، اجمیری گیٹ، دہلی
عبدالحق، ریٹائرڈ پروفیسر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی
عبدالمعود خاں، اردو ٹیچر، گورنمنٹ معینہ اسلامیہ سینئر سیکنڈری اسکول، اجمیر، راجستھان
عتیق اللہ، ریٹائرڈ پروفیسر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی
فاروق بخشی، صدر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ پی جی کالج، جھالاواڑ، راجستھان
فیروز عالم، اسسٹینٹ پروفیسر، ڈی ڈی ای، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد، آندھرا پردیش
قمر جہاں بیگم، صدر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ پی جی کالج، کوٹہ، راجستھان
قمر الہدیٰ فریدی، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، اتر پردیش
ماہ طلعت علوی، ٹی جی ٹی، اردو، جامعہ مڈل اسکول، جامعہ نگر، نئی دہلی
محمد احسن، ریجنل ڈائریکٹر، بھوپال ریجنل سینٹر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، بھوپال، مدھیہ پردیش
مظفر حنفی، ریٹائرڈ پروفیسر، اقبال چیئر، کولکاتا
محمد نفیس حسن، ٹی جی ٹی، اردو، گورنمنٹ بوائز مڈل اسکول (اردو میڈیم) اجمیری گیٹ، دہلی
محمد نورالحق، صدر، شعبۂ اردو، بریلی کالج، بریلی، اتر پردیش
نادرہ خاتون، صدر، شعبۂ اردو، جے ڈی بی گرلس گورنمنٹ کالج، کوٹہ، راجستھان
معین الدین جینابڑے، پروفیسر، ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی
ندیم احمد، اسسٹینٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیّہ اسلامیہ، نئی دہلی
یاسمین خاں، ایسوسی ایٹ پروفیسر، اردو، ایم پی راجیہ شکشا کیندر، بھوپال، مدھیہ پردیش

ممبر کوآرڈی نیٹر

دیوان حنّان خاں، پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن ان لینگویجز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی
محمد نعمان خاں ریٹائرڈ پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن ان لینگویجز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

© NCERT not to be republished

© NCERT
not to be republished

ترتیب

	پیش لفظ		*iii*
	اس کتاب کے بارے میں		*v*
1۔	سنیما کا عشق	پطرس بخاری	01 - 10
2۔	دو گز زمین (ترجمہ)	لیو ٹالسٹائی	11 - 19
3۔	مینڈک کی گرفتاری (تلخیص)	کرشن چندر	20 - 29
4۔	اَنکل فرینکی	کرنل شفیق الرحمٰن	30 - 39
5۔	پوس کی رات	پریم چند	40 - 51
6۔	جنونِ لطیفہ (تلخیص)	مشتاق احمد یوسفی	52 - 58
7۔	ٹیپو سلطان	ابراہیم یوسف	59 - 70
8۔	حکیم اجمل خاں	قاضی عبدالغفّار	71 - 78
9۔	چلیے ذرا سنبھل کر!!	ادارہ	79 - 86

© NCERT not to be republished

© NCERT
not to be republished

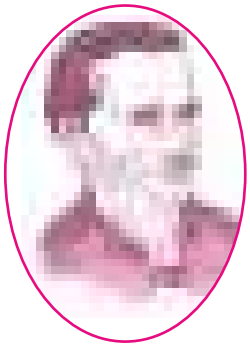

(1898 – 1958)

پطرس بخاری

اصل نام سیّد احمد شاہ بخاری تھا۔ اردو ادب میں پطرس کے قلمی نام سے مشہور ہوئے۔ انگریزی میں ایم۔ اے کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج، لاہور میں انگریزی کے استاد مقرّر ہوئے۔ بعد میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئے اور یہاں کئی برس تک ڈائریکٹر جنرل رہے۔

پطرس بخاری نے اگرچہ کم لکھا لیکن شہرت بہت حاصل کی۔ پطرس کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ 'مضامینِ پطرس' کُل دس مضامین پر مشتمل ہے مگر اس مختصر کتاب میں قہقہوں کی دنیا آباد ہے۔ انھوں نے انگریزی ادب کے مطالعے سے فائدہ اٹھایا۔ ان کی تحریروں پر انگریزی طرز کی گہری چھاپ ہے۔ ان کی عبارت میں شوخی، شگفتگی، روانی اور بے ساختہ پن نمایاں ہے۔ سیدھی سادی باتوں سے مزاح پیدا کرنا، لفظوں کے اُلٹ پھیر سے جملے چُست کرنا اور خود کو مذاق کا موضوع بنا کر اپنے اوپر ہنسنا ان کا خاص انداز ہے۔ وہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی سچّائیوں پر نظر رکھتے ہیں اور اپنے پڑھنے والوں کو خوب ہنساتے ہیں۔ اُن کی ظرافت نہایت خوش گوار اثر چھوڑتی ہے۔

© NCERT not to be republished

سنیما کا عشق

اوّل تو خدا کے فضل سے ہم سنیما کبھی وقت پر نہیں پہنچ سکے۔ اِس میں میری سُستی کو ذرا دخل نہیں۔ یہ سب قصور ہمارے دوست مرزا صاحب کا ہے۔

جب سنیما جانے کا ارادہ ہو، ہفتہ بھر پہلے سے انھیں کہہ رکھتا ہوں کہ کیوں بھئی مرزا، اگلی جمعرات چلو گے نا! میری مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ پہلے سے تیار رہیں اور اپنی تمام مصروفیتیں کچھ اس ڈھب سے ترتیب دے لیں کہ

جمعرات کے دن ان کے کام میں کوئی ہرج واقع نہ ہو لیکن وہ جواب میں عجب قدرِ ناشناسی سے فرماتے ہیں:

''ارے بھئی چلیں گے کیوں نہیں؟ کیا ہم انسان نہیں؟ ہمیں تفریح کی ضرورت نہیں ہوتی؟ اور پھر کبھی ہم نے تم سے آج تک ایسی بے مروّتی بھی برتی ہے کہ تم نے چلنے کو کہا ہو اور ہم نے تمھارا ساتھ نہ دیا ہو؟''

ان کی تقریر سن کر میں کھِسیانا سا ہو جاتا ہوں۔ کچھ دیر چپ رہتا ہوں اور پھر دبی زبان سے کہتا ہوں:

''بھئی اب کے ہو سکا تو وقت پر پہنچیں گے۔ ٹھیک ہے نا!''

میری یہ بات عام طور پر ٹال دی جاتی ہے کیوں کہ اس سے ان کا ضمیر کچھ تھوڑا سا بیدار ہو جاتا ہے۔ خیر میں بھی بہت زور نہیں دیتا۔ صِرف اُن کو بات سمجھانے کے لیے اتنا کہہ دیتا ہوں:

''کیوں بھئی! سنیما آج کل چھے بجے شروع ہوتا ہے نا؟''

مرزا صاحب عجب معصومیت کے انداز میں جواب دیتے ہیں:

''بھئی! یہ ہمیں معلوم نہیں۔''

''میرا خیال ہے چھے ہی بجے شروع ہوتا ہے۔''

''اب تمھارے خیال کی تو کوئی سَنَد نہیں۔''

''نہیں مجھے یقین ہے۔ چھے بجے شروع ہوتا ہے۔''

''تمھیں یقین ہے تو میرا دماغ کیوں مفت میں چاٹ رہے ہو؟''

اس کے بعد آپ ہی کہیے میں کیا بولوں؟

خیر جناب، جمعرات کے دن چار بجے ہی ان کے مکان کو روانہ ہو جاتا ہوں۔ اس خیال سے کہ جلدی جلدی انھیں تیار کرا کے وقت پر پہنچ جائیں۔ دولت خانے پر پہنچتا ہوں تو آدم نہ آدم زاد۔ مردانے کے سب کمروں میں گھوم جاتا ہوں۔ ہر کھڑکی میں سے جھانکتا ہوں، ہر شِگاف میں سے آوازیں دیتا ہوں لیکن کہیں سے رسید نہیں ملتی۔

© NCERT not to be republished

آخر تنگ آ کر ان کے کمرے میں بیٹھ جاتا ہوں۔ وہاں دس پندرہ منٹ سیٹیاں بجاتا رہتا ہوں۔ دس پندرہ منٹ پنسل سے بلاٹنگ پیپر پر تصویریں بناتا رہتا ہوں۔ باہر ڈیوڑھی میں نکل کر اِدھر اُدھر جھانکتا ہوں۔ وہاں بدستور ہُو کا عالم

دیکھ کر کمرے میں واپس آ جاتا ہوں اور اخبار پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ ہر کالم کے بعد مرزا صاحب کو ایک آواز دے لیتا ہوں۔ اس اُمید پر کہ شاید ساتھ کے کمرے میں یا عین اوپر کے کمرے میں تشریف لے آئے ہوں۔ سو رہے تھے تو ممکن ہے جاگ اٹھے ہوں یا نہا رہے تھے تو شاید غسل خانے سے باہر نکل آئے ہوں لیکن میری آواز مکان کی وسعتوں میں سے گونج کر واپس آ جاتی ہے۔ آخر کار ساڑھے پانچ بجے کے قریب زنانے سے تشریف لاتے ہیں۔ میں اپنے کھولتے ہوئے خون کو قابو میں لا کر متانت اور اخلاق کو بڑی مشکل سے مدِّ نظر رکھ کر پوچھتا ہوں:

''کیوں حضرت! آپ اندر ہی تھے؟''

''ہاں اندر ہی تھا۔''

''میری آواز آپ نے نہیں سُنی؟''

''اچھّا یہ تم تھے؟ میں سمجھا کوئی اور ہے۔''

آنکھیں بند کر کے سر کو پیچھے ڈال لیتا ہوں اور دانت پیس کر غصّے کو پی جاتا ہوں اور پھر کانپتے ہوئے ہونٹوں سے پوچھتا ہوں:

''تو اچھا آپ چلیں گے یا نہیں؟''

''وہ کہاں؟''

''ارے بندۂ خدا، آج سنیما نہیں جانا؟''

''ہاں سنیما۔ سنیما (یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں) ٹھیک ہے۔ سنیما، میں بھی سوچ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ایسی ہے جو مجھے یاد نہیں آ رہی ہے۔ اچھا ہوا تم نے یاد دلا دیا ورنہ مجھے رات بھر الجھن رہتی۔''

''تو چلو پھر اب چلیں؟''

''ہاں وہ تو چلیں گے ہی۔ میں سوچ رہا تھا آج ذرا کپڑے بدل لیتے۔ خدا جانے دھوبی کمبخت کپڑے بھی لایا ہے یا نہیں۔ یار ان دھوبیوں کا تو کوئی انتظام کرو۔''

پھر یہ کہہ کر اندر تشریف لے جاتے ہیں کہ اچھا کپڑے پہن آؤں۔

مرزا صاحب کے کپڑے پہننے کا عمل اس قدر طویل ہے کہ اگر میرا اختیار ہوتا تو قانون کی رو سے انھیں کبھی کپڑے اتارنے ہی نہ دیتا۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ کپڑے پہنے ہوئے تشریف لاتے ہیں۔ ایک پان مُنہ میں، دوسرا ہاتھ میں ۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ دروازے تک پہنچ کر مڑ کے جو دیکھتا ہوں تو مرزا صاحب غائب۔ پھر اندر آ جاتا ہوں۔ مرزا صاحب کسی کونے میں کھڑے کچھ کُرید کر رہے ہیں۔

''ارے بھئی چلو۔''

''چل تو رہا ہوں یار۔ آخر اتنی بھی کیا آفت ہے؟''

''اور یہ تم کر کیا رہے ہو؟''

''پان کے لیے ذرا تمبا کو لے رہا تھا۔''

تمام راستے مرزا صاحب چہل قدمی فرماتے جاتے ہیں۔ میں ہر دو تین لمحے کے بعد اپنے آپ کو ان سے چار پانچ قدم آگے پاتا ہوں۔ کچھ دیر ٹھہر جاتا ہوں۔ وہ ساتھ آ ملتے ہیں تو پھر چلنا شروع کر دیتا ہوں۔ پھر آگے نکل جاتا ہوں۔ پھر ٹھہر جاتا ہوں۔ غرض یہ کہ گو چلتا دُگنی تِگنی رفتار سے ہوں لیکن پہنچتا ان کے ساتھ ہی ہوں۔

ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوتے ہیں تو اندھیرا گُھپ۔ بہتیرا آنکھیں جھپکتا ہوں، کچھ سُجھائی نہیں دیتا۔ ادھر سے کوئی آواز دیتا ہے، ''یہ دروازہ بند کر دو جی۔'' یا اللہ اب کہاں جاؤں؟ رستہ، کرسی، دیوار، آدمی کچھ بھی تو نظر نہیں آتا۔ ایک قدم بڑھاتا ہوں تو سر اُن بالٹیوں سے جا ٹکراتا ہے جو آگ بجھانے کے لیے دیوار پر لٹکی رہتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد

تاریکی میں کچھ دُھندلے سے نقش دکھائی دینے لگتے ہیں۔ جہاں ذرا سا تاریک سا دھبّا دکھائی دے جائے وہاں سمجھتا ہوں کرسی خالی ہوگی۔ خمیدہ پُشت ہو کر اس کا رُخ کرتا ہوں۔ اِس کے پاؤں کو پھاند، اُس کے ٹخنوں کو ٹھکرا، خواتین کے گھٹنوں سے دامن بچا کر، آخر کار کسی کی گود میں جا بیٹھتا ہوں۔ وہاں سے نکال دیا جاتا ہوں اور لوگوں کے دھکّوں

کی مدد سے کسی خالی کرسی تک جا پہنچتا ہوں۔ مرزا صاحب سے کہتا ہوں ''میں نہ بکتا تھا کہ جلدی چلو۔ خواہ مخواہ میں ہم کو رسوا کروایا نا۔ گدھا کہیں کا!'' اس شگفتہ بیانی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ کی کرسی پر جو حضرت بیٹھے ہیں اور جن کو میں مخاطب کر رہا ہوں وہ مرزا نہیں کوئی بزرگ ہیں۔

اب تماشے کی طرف متوجّہ ہوتا ہوں اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ فلم کون سی ہے؟ اس کی کہانی کیا ہے؟ اور کہاں تک پہنچ چکی ہے؟ اس انتظار میں رہتا ہوں کہ کچھ لکھا ہوا سامنے آئے، تو معاملہ کھُلے کہ اتنی دیر میں سامنے کی کرسی پر بیٹھے ہوئے حضرت ایک وسیع اور فراخ انگڑائی لیتے ہیں جس کے دوران میں کم از کم دو تین سوفٹ فلم گزر جاتی ہے۔ جب انگڑائی کو لپیٹ لیتے ہیں تو پھر سر کھُجانا شروع کرتے ہیں اور اس عمل کے بعد ہاتھ کو سر سے نہیں ہٹاتے بلکہ بازو کو ویسے ہی خَمیدہ رکھے رہتے ہیں۔ میں مجبوراً سر کو نیچا کر کے چائے دانی کے اس دستے کے بیچ میں سے اپنی نظر کے لیے راستہ نکال لیتا ہوں اور اپنے بیٹھنے کے انداز سے بالکل ایسا معلوم ہوتا ہوں کہ جیسے ٹکٹ خریدے بغیر اندر گھس آیا ہوں اور چوروں کی طرح بیٹھا ہوا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد انھیں کرسی کی نَشِست پر کوئی مچھّر یا پسّو محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ دائیں طرف سے ذرا اونچے ہو کر بائیں طرف کو جھک جاتے ہیں۔ میں مصیبت کا مارا دوسری طرف جُھک جاتا ہوں۔ ایک دو لمحے کے بعد وہی مچھّر دوسری طرف ہجرت کر جاتا ہے۔ چنانچہ ہم دونوں پھر سے پینترا بدل لیتے ہیں۔ غرض یہ کہ یہ دل لگی یوں ہی جاری رہتی ہے۔ وہ دائیں تو میں بائیں، وہ بائیں تو میں دائیں۔ ان کو کیا معلوم کہ اندھیرے میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ دل یہی چاہتا ہے کہ اگلے درجے کا ٹکٹ لے کر ان کے آگے جا بیٹھوں اور کہوں کہ لے بیٹا! دیکھوں تو اَب تُو کیسے فلم دیکھتا ہے؟

پیچھے سے مرزا صاحب کی آواز آتی ہے ''یار! تم سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ اب جو ہمیں ساتھ لائے ہو تو فلم تو دیکھنے دو۔'' اس کے بعد غُصّے میں آ کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ دل میں کہتا ہوں ایسی کی تیسی اس فلم کی۔ سو سو قسمیں کھاتا ہوں کہ پھر کبھی نہ آؤں گا اور اگر آیا بھی تو اس کمبخت مرزا سے ذکر تک نہ کروں گا۔ پانچ چھے گھنٹے پہلے سے آ جاؤں گا۔ اوپر کے درجے میں سب سے اگلی قطار میں بیٹھوں گا۔ تمام وقت اپنی نَشِست پر اُچھلتا رہوں گا۔ بہت بڑے طُرّے والی

پگڑی پہن کر آؤں گا۔ اپنے اوور کوٹ کو دو چھڑیوں پر پھیلا کر لٹکا دوں گا۔ بہر حال مرزا کے پاس تک نہ پھٹکوں گا۔

لیکن اس کمبخت دل کو کیا کروں؟ اگلے ہفتے پھر کسی اچھی فلم کا اشتہار دیکھ پاتا ہوں تو سب سے پہلے مرزا کے ہاں جاتا ہوں اور گفتگو پھر وہیں سے شروع ہوتی ہے کہ ''کیوں بھئی مرزا! اگلی جمعرات سنیما چلو گے نا؟''

(پطرس بخاری)

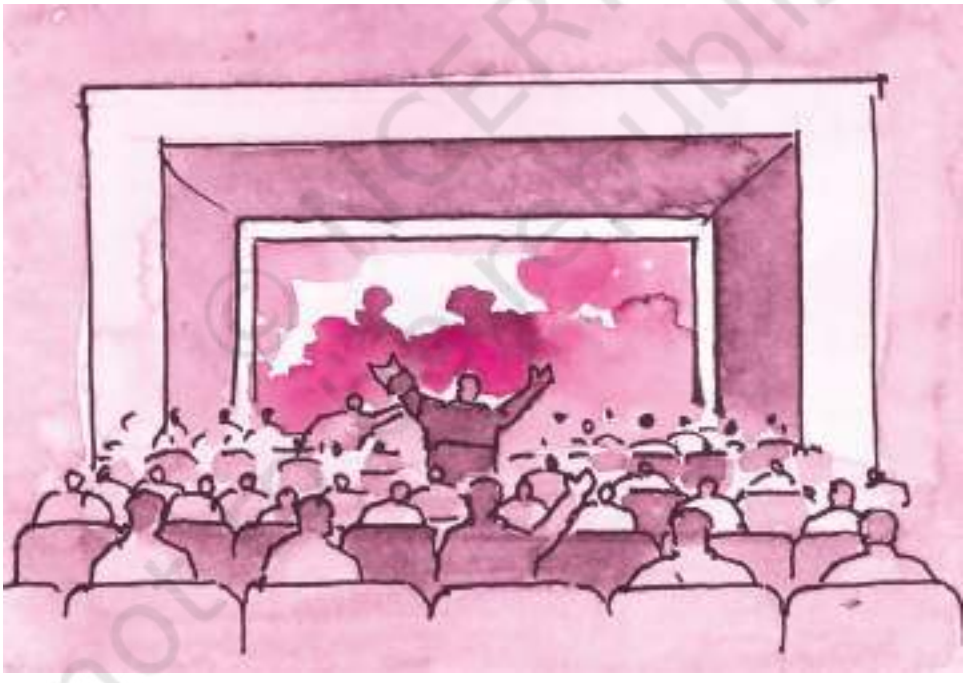

© NCERT not to be republished

مشق

• معنی یاد کیجیے

قدر ناشناسی	:	نا قدری، کسی لائق نہ سمجھنا، کوئی اہمیت نہ دینا
بے مروّتی	:	کسی کے لیے دل میں جگہ نہ ہونا، لحاظ نہ کرنا
ضمیر بیدار ہونا	:	احساس جاگنا
سَنَد	:	ثبوت
آدم نہ آدم زاد	:	جہاں کوئی نہ ہو
شِگاف	:	جھری، دراڑ
رسید نہ ملنا	:	جواب نہ ملنا
بدستور	:	ٹھیک اُسی طرح
عین	:	ٹھیک، بالکل
متانت	:	سنجیدگی
طویل	:	لمبا
چہل قدمی فرمانا	:	آہستہ آہستہ چلنا
نشست	:	بیٹھنے کی جگہ
خواہ مخواہ	:	بلا وجہ
معصومیت	:	بھولا پن

© NCERT not to be republished

دولت خانہ	:	گھر، دوسرے کے گھر کے لیے بولتے ہیں
ہؤ کا عالَم	:	سنّاٹا
وُسعت	:	پھیلاؤ
مدِّ نظر رکھنا	:	نظر کے سامنے رکھنا، لحاظ رکھنا
قانون کی رُو سے	:	قانون کے مطابق
مخاطب کرنا	:	خطاب کرنا، توجہ دلانا
ہِجرت کر جانا	:	ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جانا
اخلاق	:	اچھا عمل، اچھا سلوک
خمیدہ	:	جُھکا ہوا
پُشت	:	پیٹھ
شگفتہ بیانی	:	دل چسپ گفتگو، بات چیت کا خوب صورت انداز
وسیع اور فراخ	:	لمبا چوڑا
قطار	:	لائن

سوچیے اور بتائیے

1۔ مصنّف ایک ہفتہ پہلے سے ہی سنیما کا پروگرام کیوں بناتا تھا؟

2۔ مرزا صاحب کے انتظار سے تنگ آ کر مصنّف نے کیا کیا؟

3۔ سنیما ہال میں پہنچ کر مصنّف پر کیا گزری؟

4۔ غصّے میں پطرس نے کیا قسم کھائی؟

5۔ پطرس کی قسم کا کیا انجام ہوا؟

© NCERT not to be republished

(1828 – 1910)

لیو ٹالسٹائی

ٹالسٹائی کا شمار دنیا کے مشہور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ روسی ادب میں بحیثیت ناول نگار ان کا قد بہت بلند ہے۔ ٹالسٹائی روس کے ایک رئیس گھرانے میں پیدا ہوئے۔ تعلیم مکمّل کرنے کے بعد تیئس سال کی عمر میں روسی فوج میں بھرتی ہو گئے اور کریمین جنگ میں حصّہ لیا۔ اسی عرصے میں انھوں نے اپنا پہلا ناول 'بچپن' لکھا جسے ادبی حلقے میں کافی سراہا گیا۔ اس طرح اپنے پہلے ناول سے ٹالسٹائی کا شمار معروف ادیبوں میں ہونے لگا۔ اپنے باغیانہ خیالات کے لیے انھیں عتاب کا شکار بھی ہونا پڑا۔

ٹالسٹائی نے متعدّد ناول، کہانیاں اور ڈرامے لکھے۔ ان کے ناول 'جنگ اور امن' اور 'انّا کرینینا' کو عالمی ادب میں شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ ٹالسٹائی کو روسی سماج اور تہذیب کا مصوّر کہا جاتا ہے۔ انھوں نے روسی معاشرے کے جاگیردارانہ نظام کی تلخ حقیقتوں کو اپنے ناولوں میں بڑی فنکاری کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔ ان کے ناول اور کہانیاں حقیقت نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کی تحریروں میں اصلاحی پہلو نمایاں ہے۔

© NCERT not to be republished

دو گز زمین

بہت دن ہوئے، رؤس کے ایک گاؤں میں ایک کسان رہتا تھا۔ اس کا نام تھا نچوم۔ نچوم کو اس بات کا غم کھائے جاتا تھا کہ وہ ایک بڑی زمین کا مالک نہیں ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے پاس اتنی زمین ہو کہ کوئی کسان اس کی برابری نہ کر سکے۔ اسی گاؤں میں ایک بوڑھی عورت رہتی تھی جو کافی زمین کی مالک تھی۔ اُس نے اپنی زمین بیچنے کا ارادہ کیا۔ گاؤں کے بہت سے لوگوں نے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق زمین کے چھوٹے بڑے ٹکڑے خرید لیے۔ نچوم بھی زمین خریدنا چاہتا تھا مگر اس کے پاس رقم کم تھی۔ آخر زمین کی مالکہ اس پر راضی ہوگئی کہ بقیہ رقم وہ سال بھر بعد ادا کرے۔ اس طرح نچوم نے بھی تھوڑی سی زمین خرید لی۔ اب اس کے پاس پہلے سے زیادہ زمین تھی مگر اس کے دل کو اطمینان نہ تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ایک بڑا زمین دار بنے۔

ایک دن نچوم اپنے صحن میں بیٹھا تھا کہ ایک مسافر ادھر سے گزرا۔ نچوم نے اسے آواز دی اور پوچھا کہ آپ کہاں سے آ رہے ہیں۔ مسافر نے بتایا کہ میں والگا ندی کے اس پار ایک زمین دیکھ کر آ رہا ہوں۔ وہاں ایک نئی بستی بسائی جا رہی ہے اور لوگوں کو مفت زمین دی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی چاہے تو زیادہ زمین خرید بھی سکتا ہے۔

نچوم کے تو دل کی مُراد بَر آئی۔ وہ اپنی زمین اور مکان بیچ کر وہاں چلا گیا اور سرکار سے ملنے والی

زمین کے علاوہ مزید زمین خرید کر ایک بڑی زمین کا مالک ہو گیا۔ اُس نے گاؤں کی بوڑھی عورت کو بقایا رقم بھی ادا کر دی۔

نئی جگہ پر نجوم کی دوستی نئے لوگوں سے ہوئی۔ ان میں سے کئی ایسے تھے جن کے پاس نجوم سے زیادہ زمین تھی۔ چنانچہ اُسے اپنی زمین پھر چھوٹی لگنے لگی۔ ایک دن ایک تاجر سے نجوم کی ملاقات ہوئی۔ وہ تاجر مختلف علاقوں میں جا جا کر اپنا مال بیچتا تھا۔ اُس نے نجوم کو بتایا: ''یہاں سے دور باشکروں کے علاقے میں زمین بہت سستی ہے۔ باشکروں کے پاس زمین بے حساب ہے مگر وہ کھیتی باڑی کرنا نہیں جانتے۔ مویشی پالتے ہیں اس لیے زمین بہت سستے داموں میں بیچ دیتے ہیں۔ یہ لوگ سیدھے سادے ہیں۔ اگر ان کے لیے تحفے لے جاؤ تو وہ اور خوش ہو جائیں گے۔''

یہ سُن کر نجوم کی باچھیں کِھل گئیں اور وہ وہاں کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس نے بہت سے تحفے تحائف خریدے اور ایک نوکر کو ساتھ لے کر باشکروں کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ سات دن اور سات رات کا سفر کرنے کے بعد

ان کی گھوڑا گاڑی باشکروں کے علاقے میں پہنچ گئی۔ تحفے پاکر باشکر بہت خوش ہوئے اور نچوم کا شکریہ ادا کرکے پوچھا: ''ہم آپ کی کیا خدمت کرسکتے ہیں؟''

''میں آپ کی کچھ زمین خریدنا چاہتا ہوں۔'' نچوم نے کہا۔

''ہمارے پاس بہت زمین ہے۔ آپ جتنی اور جدھر کی چاہیں پسند کرلیں۔'' ایک لمبے قد کا نوجوان جو کھال کی ٹوپی پہنے ہوئے تھا، بولا۔ یہ باشکروں کا سردار تھا۔

''زمین کی قیمت؟'' نچوم نے سوال کیا۔

''ایک دن کے ایک ہزار رُوبل!'' سردار نے جواب دیا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' نچوم نے کہا۔

''مطلب یہ کہ ایک دن جتنی زمین کے اطراف آپ چکّر لگالیں گے وہ ایک ہزار رُوبل میں آپ کی ہو جائے گی۔'' سردار نے جواب دیا۔

''ایک دن میں تو آدمی بہت بڑی زمین کے گرد چکّر لگا سکتا ہے۔'' نچوم نے خوش ہوکر کہا۔

سردار نے جواب دیا: ''جی ہاں! مگر شرط یہ ہے کہ جس جگہ سے آپ سورج نکلتے ہی چلنا شروع کردیں گے، اُسی جگہ سورج ڈوبنے سے پہلے آپ کو پہنچنا ہوگا۔ اگر آپ پہنچ گئے تو جتنا بڑا چکّر آپ لگالیں گے اس کے اندر کی ساری زمین آپ کی ہوگی اور نہ پہنچ پائے تو نہ ہی زمین ملے گی اور نہ ہی آپ کی رقم واپس ہوگی۔''

بھلا نچوم کو اس میں کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ اُس نے فوراً یہ شرط مان لی۔ رات زیادہ ہوچکی تھی۔ نچوم سونے کے لیے چلا گیا۔ سورج کی پہلی کِرن کے ساتھ اس کو اپنا سفر شروع کرنا تھا۔ اس نے جلدی سے ملازم کو جگایا، تیزی سے تیار ہوا اور فوراً سردار کی جھونپڑی میں پہنچ گیا۔

سب باشکر وہاں پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ ناشتہ کرکے سورج نکلنے سے پہلے ہی ٹیلے پر جمع ہوگئے۔ نچوم کو یہیں سے اپنا سفر شروع کرنا تھا۔ سردار نے اس سے ایک ہزار روبل لے کر اپنی ٹوپی میں ڈالے اور پھر ٹوپی زمین پر رکھ دی۔

نچوم نے پہلے سے طے کرلیا تھا کہ مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کی طرف چلنا شروع کردے گا، دوپہر سے پہلے بائیں کو گھوم جائے گا اور چکّر لگاتا ہوا شام سے پہلے لَوٹ کر ٹیلے پر پہنچ جائے گا۔

چنانچہ اُدھر سورج نے مشرق سے جھانکا اور ادھر نچوم نے اپنا پہلا قدم اٹھایا۔ اس کے پیچھے پیچھے کئی باشکر زمین میں کھونٹیاں گاڑتے چلے آرہے تھے۔ تقریباً پانچ میل تک وہ ایک ہی رفتار سے چلتا رہا۔ نہ بہت تیز نہ بہت آہستہ۔ اتنی دور چلنے کے بعد اس کے جسم میں گرمی آگئی۔ اس نے اپنی واسکٹ کے بٹن کھول دیے اور ذرا تیز چلنے لگا۔ کوئی پانچ میل اور چلنے کے بعد اسے تھکن محسوس ہونے لگی۔ سورج بھی اب کافی اوپر آگیا تھا اور اس کی کرنیں آنکھوں میں چبھنے لگی تھیں۔ نچوم نے سوچا کہ کوئی پانچ میل سیدھا چلنے کے بعد وہ بائیں طرف مڑ جائے گا اور سورج کے اوپر آتے ہی واپسی

کا سفر شروع کر دے گا۔ مگر وہ جتنا آگے بڑھتا جاتا تھا، اتنی ہی ہریالی اور اُونچی گھاس اسے نظر آتی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آگے کی زمین زیادہ زرخیز ہے۔ وہ لالچ میں آکر بڑھتا گیا اور بائیں طرف مڑنا ہی بھول گیا۔

نچوم جتنا آگے بڑھتا جاتا تھا، اتنی ہی اچھی زمین اس کے پیروں تلے آتی جاتی تھی اور زیادہ سے زیادہ زمین حاصل کرنے کی اس کی ہَوَس بڑھتی جاتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی رفتار اور بھی بڑھا دیتا تھا۔ اچانک اس کی نظر اپنے سائے پر پڑی جو اس کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ سورج مغرب کی طرف ڈھل چکا تھا لیکن وہ واپس مڑنے کے بجائے بائیں طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اب ٹیلے کی طرف مڑنا چاہیے مگر زمین کے لالچ نے اسے مڑنے نہ دیا اور وہ آگے بڑھتا ہی گیا۔

سورج ڈوبنے میں اب زیادہ دیر نہ تھی مگر اب تک اسے ٹیلہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُس کی سانس لوہار کی دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ حلق میں پیاس سے کانٹے پڑ گئے تھے۔ تھکن سے دم نکل رہا تھا۔ مگر وہ دوڑتا گیا، دوڑتا گیا۔ ڈوبتے سورج کی کرنیں اس کی آنکھوں میں چبھنے لگیں اور سامنے کا منظر دھندلا سا ہو گیا۔

اب اسے ٹیلہ نظر آنے لگا تھا۔ سورج ٹیلے کے پیچھے چلا گیا تھا۔ وہ اُس ٹیلے پر کھڑے ہوئے لوگوں کے دھندلے سایے دیکھ سکتا تھا۔ وہ لوگ ہاتھ ہلا ہلا کر اُسے بلا رہے تھے لیکن اُن کی آوازیں اس کے کانوں میں نہیں پہنچ رہی تھیں، کیوں کہ ابھی کافی فاصلہ باقی تھا۔

نچوم نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی۔ جیسے جیسے ٹیلہ نزدیک آتا گیا اُس کی جدوجہد بھی تیز ہوتی گئی لیکن اب پیر اُس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ ان سے خون رِسنے لگا تھا۔ کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگی تھیں۔ دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ دَم پھولنے لگا تھا اور جسم پسینے میں شرابور تھا مگر وہ رُک نہیں سکتا تھا۔ اُسے ایک بہت بڑی زمین کا مالک جو بننا تھا۔

کسی نہ کسی طرح وہ ٹیلے کے قریب پہنچ گیا۔ لوگ اُس کی ہمّت بڑھا رہے تھے۔ ''اور تیز اور تیز!'' کی آوازیں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ وہ ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ سردار کی ٹوپی اسے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ پھر وہ جان توڑ کر دوڑنے

لگا لیکن تیزی سے ٹیلے پر چڑھنا آسان نہ تھا۔ وہ بار بار ٹھوکریں کھا رہا تھا، اُدھر سورج کی کرنیں ٹوپی کے کناروں کو چھو رہی تھیں۔ اچانک نچوم زبردست ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ گرتے گرتے بھی اپنا ہاتھ ٹوپی کی طرف بڑھایا مگر وہ اس کی انگلیوں سے اب بھی کچھ دور ہی تھی۔

سورج ڈوبنے کے ساتھ ساتھ نچوم کی زندگی کا آفتاب بھی ہمیشہ کے لیے غُروب ہوگیا۔ اس کے دل کی حرکت بند ہوچکی تھی۔ سردار کی ٹوپی اور نچوم کے بیچ دوگز کا فاصلہ باقی رہ گیا تھا۔ اسی جگہ پر قبر کھود کر نچوم کو دفنا دیا گیا۔

ہر انسان کی طرح نچوم کے حِصّے میں بھی دوگز زمین ہی آئی۔

(ٹالسٹائی)

© NCERT not to be republished

مشق

• معنی یاد کیجیے

رَقم	:	روپے پیسے
بقیہ	:	باقی، بچا ہوا
زمین دار	:	زمین کا مالک
صحن	:	آنگن
مُراد بر آنا (محاورہ)	:	تمنّا پوری ہونا، مقصد پورا ہونا
تاجر	:	تجارت کرنے والا، بیوپاری
مزید	:	زیادہ، اور
مویشی	:	وہ پالتو جانور جن سے کھیتی باڑی کے کاموں میں مدد لی جاتی ہے۔
باچھیں کِھلنا (محاورہ)	:	خوش ہو جانا
تحائف	:	تحفہ کی جمع
اطراف	:	طرف کی جمع
رُوبل	:	روسی سکّہ
مشرق	:	وہ سمت جدھر سے سورج نکلتا ہے، پورب
زرخیز	:	اُپجاؤ، زیادہ فصل پیدا کرنے والی زمین
ہَوس	:	لالچ

© NCERT not to be republished

مغرب : وہ سمت جدھر سورج ڈوبتا ہے، پچھّم

دھونکنی : چمڑے سے بنی مَشک جو ہوا دے کر آگ تیز کرنے کے کام آتی ہے۔

جِدّ وجہد : کوشش

شرابور : بھیگا ہوا

آفتاب : سورج

غروب : ڈوبنا

فاصلہ : دوری

• سوچیے اور بتائیے

1۔ نجوم کی کیا خواہش تھی؟

2۔ تاجر نے نجوم کو کیا مشورہ دیا؟

3۔ باشکروں کے سردار نے زمین فروخت کرنے کی کیا شرط رکھی؟

4۔ نجوم شرط کے مطابق وقت پر واپس کیوں نہیں پہنچ سکا؟

5۔ نجوم کا کیا انجام ہوا؟

6۔ 'دوگز زمین' سے کیا مراد ہے؟

© NCERT not to be republished

کرشن چندر

(1914 – 1977)

کرشن چندر وزیرآباد، ضلع گجراں والا، پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پونچھ، (جمّوں کشمیر) میں ہوئی۔ 1930 کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور گئے۔ 1934 میں پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔اے کیا۔ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوئے پھر ممبئی کی فلمی دنیا سے منسلک ہوکر آخر وقت تک ممبئی ہی میں رہے اور وہیں انتقال ہوا۔ ترقی پسند تحریک سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ پریم چند کے بعد جن افسانہ نگاروں نے غیر معمولی شہرت حاصل کی، اُن میں ایک اہم نام کرشن چندر کا بھی ہے۔ وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے لیکن انھوں نے ناول، ڈرامے، ریپورتاژ اور مضامین بھی لکھے ہیں۔

ان کی مقبولیت کا سبب ان کی حقیقت پسندی، رومانیت اور خوب صورت اندازِ بیان ہے۔ 'یوکلپٹس کی ڈالی'، 'مہالکشمی کا پُل' 'اَن داتا' ان کے اہم افسانوی مجموعے ہیں۔

ان کے ناولوں میں 'شکست'، 'جب کھیت جاگے' اور 'آسمان روشن ہے' کے علاوہ 'ایک گدھے کی سرگزشت' کو خاص مقبولیت حاصل ہوئی۔

© NCERT not to be republished

مینڈک کی گرفتاری

مدّت کے بعد آج جھیل کے کنارے پر بھی خوشیوں بھری رات آئی تھی۔ آج دراصل بڑا مینڈک بڑے محل سے چھوٹ کر آیا تھا اس لیے اس کی بیوی پُکھراج نے اور اُس کے تین بیٹوں ٹمپو، جمپو اور پھونپو نے جھیل کے سارے مینڈکوں کی ضیافت کی تھی۔ سبھی طرح کے مینڈک آئے تھے اور اُچھل اُچھل کر بڑے مینڈک سے جس کا نام زرد پوش تھا، گلے مل رہے تھے۔

دعوت کے بعد سارے مینڈک آلتی پالتی مارے ایک دائرے کی صورت میں زرد پوش کے گرد بیٹھ گئے اور اس سے بڑے محل کی باتیں پوچھنے لگے۔ کیونکہ اب تک کوئی مینڈک اس بڑے محل کے اندر نہیں جا سکا تھا۔ سب سے پہلے جھیل کے بہت بوڑھے مینڈک نے سوال کیا۔

''جب تم محل کے اندر گئے تو تم نے کیا دیکھا؟'' زرد پوش نے کہا ''دادا یہ غلط ہے کہ میں خود محل کے اندر گیا، میں دراصل یوں ہی سنگ مرمر کی سیڑھوں پر لیٹا دھوپ سینک رہا تھا کیونکہ دھوپ تیز تھی اور سنگِ مرمر کا فرش ٹھنڈا تھا۔ اس لیے میں آنکھیں بند کیے زندگی کے مزے لے رہا تھا اتنے میں مجھے معلوم ہوا گویا کسی نے مجھے اپنی مُٹّھی میں اُچک لیا۔ میں نے اپنی نیند سے چُندھیائی ہوئی آنکھیں حیرت سے کھولیں تو اپنے آپ کو بڑے محل کے راجا کے سب سے چھوٹے لڑکے کی مٹھی میں پایا۔ اس نے میرے جسم کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا لیکن میرا مُنہ اس کی مٹھی سے باہر تھا۔ اس لیے میں محل کے دالان، برآمدے، کھلے وسیع کمرے، قالین سب دیکھ سکتا تھا۔''

''قالین کیا ہوتا ہے؟'' ٹمپو نے پوچھا۔

زرد پوش نے کہا ''بیٹے قالین وہ لوگ فرش پر بچھاتے ہیں، بڑا نرم اور گدگدا ہوتا ہے۔''

ٹمپو نے پوچھا ''کیا قالین ہماری جھیل کے کیچڑ سے بھی نرم اور ملائم ہوتا ہے؟''

زرد پوش نے کہا ''ارے بیٹے یہ وحشی قوم ہماری کیچڑ ایسی نرم قالین سات سو سال میں بھی نہیں بنا سکتی مگر ہاں ویسے قالین بُرا نہیں ہوتا اور مجھے تو اُس کا رنگ بہت پسند آیا۔ ہماری کیچڑ میں تو ایک ہی رنگ ہوتا ہے۔ مگر اُس قالین میں طرح طرح کے رنگ تھے۔ جھیل کے پھولوں کی طرح خوش رنگ اور چہکتے ہوئے۔ ہمیں اپنی کیچڑ کا رنگ بہت

پسند ہے۔ مجھے وہ قالین اور دوسرے بہت سے رنگوں والے قالین بہت پسند آئے مگر یہ تو بعد کی بات ہے میں بتا رہا تھا کہ جب وہ لڑکا دیوان خانے میں لے گیا۔ جہاں ہمّت سنگھ اور اس کی رانی اور تین بڑے لڑکے اور آٹھ دس صاحب بیٹھے تھے وہ مجھے مُٹّھی میں دابے دابے چپکے سے ایک جگہ بیٹھ گیا اور پھر جب وہ لوگ اپنی باتوں میں مشغول ہو گئے تو اس نے چُپکے سے مجھے رانی کی گود میں چھوڑ دیا۔ پھر میں نے جو وہاں سے تین گز کی چھلانگ لگائی ہے تو سارے دیوان خانے میں ہلاّ ہو گیا۔ راجا ہمّت سنگھ ڈر کے مارے زمین پر گر پڑے۔ ہاہاہا یہ لوگ ہماری قوم سے کتنا ڈرتے ہیں۔''

بہت سے مینڈک ہنسنے لگے۔ بھورا نے سر اٹھا کے کہا ''میں جانتا ہوں آدمی اُوپر سے بہادر بنتا ہے اندر سے بڑا کمزور ہوتا ہے اور پانی میں تو اس کی جان نکلتی ہے۔ ارے یہ کیا کھا کے مینڈک کا مقابلہ کرے گا۔''

زرد پوش نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ''اس کے بعد جو ہڑبونگ مچی ہے اس کا اندازہ ہی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ بیس تیس آدمی میرے آگے پیچھے دوڑ رہے تھے مگر میں کسی کے قابو میں نہ آتا اور راجا ہمّت سنگھ اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے چلاّ رہے تھے۔ ارے نہیں چھوڑنا جانے نہ پائے کہ میں نے چھلانگ لگائی اور ان کے سر پر بیٹھ گیا تو راجا صاحب وہاں سے اُٹھ کے بھاگے۔ میں نے وہاں سے دوسری چھلانگ لگائی اور دوسرے کمرے میں پہنچ گیا مگر یہاں آ کر آخر راجا کے چھوٹے لڑکے نے اندر سے دروازہ بند کر لیا اور مجھے پکڑ لیا مگر میں نے بھی بچّہ جی کو خوب خوب پریشان کیا، ایسے تھوڑا ہی قابو میں آتا تھا۔''

''شاباش شاباش۔'' بہت سے مینڈک ایک دَم چلاّئے۔ پُکھراج غرور سے اپنے خاوند کی طرف دیکھنے لگی۔

''پھر کیا ہوا۔'' بھورا نے پوچھا۔

''پھر مجھے اس شریر لڑکے نے اپنی مُٹّھی سے ایک ٹوکری میں بند کر دیا جس میں مَیں پھُدک پھُدک کے رہ گیا۔ ٹوکری بہت مضبوط تھی اور اس میں دو سوراخ تھے وہ اتنے بڑے نہیں تھے کہ میں ان میں سے باہر نکل سکتا۔''

''تم اس میں کتنے دن قید رہے۔'' دادا نے پوچھا۔

''دس دن اور دس راتیں۔ لیکن راتیں بہت پریشان کرتی تھیں۔ جب لڑکا اپنے کمرے کی کھڑکی کھول دیتا تھا تو جھیل سے آپ لوگوں کے ٹرّانے کی آواز آتی تھی تو میرے دِل کی کیا حالت ہوتی تھی، یہ میں اِس وقت نہیں بتا سکتا۔''

پُکھراج کی گول گول معصوم آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

کالے سر جس مینڈک کا نام تھا، وہ جھیل کا سب سے عالم مینڈک تھا۔ اس نے پوچھا۔

''بھائی زرد پوش انسانوں کی زبان کے بارے میں تم کیا کہتے ہو۔''

''محترم بزرگ''۔ زرد پوش نے اُداسی سے سر جُھکا کے کہا ''انسانوں کی ایک زبان نہیں ہوتی اُن کی دو زبانیں ہوتی ہیں۔''

''دو زبانیں!'' کالے سر نے حیرت سے آنکھیں کھول کر کہا۔ ''یہ ناممکن ہے۔ دُنیا میں ہر ایک قوم کی ایک ہی زبان ہوتی ہے، صرف ایک زبان۔''

''مگر انسانوں کی دو زبانیں ہوتی ہیں ایک تو وہ جسے وہ بولتے ہیں دوسری وہ جسے وہ دل میں رکھتے ہیں اور اکثر وہ لفظ جو دل میں ہوتا ہے کبھی زبان پر نہیں آتا۔ اکثر جو مُنہ کی زبان ہوتی ہے وہ دِل کی زبان کے خلاف ہوتی ہے۔''

''وہ کیسے؟ میں سمجھا نہیں بھائی۔''

''محترم بزرگ۔'' زرد پوش نے تشریح کرتے ہوئے بتایا۔ ''چھوٹے راج کمار کی ماں نے اس سے کہا تو اس بے چارے مینڈک کو چھوڑ دے۔ راج کمار نے کہا ہاں ماں میں اسے ابھی چھوڑ دیتا ہوں۔ اس کے بعد اس نے مجھے آزاد نہیں کیا بلکہ ایک ٹوکری سے دوسری ٹوکری میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا۔''

''دوسری بات''۔

''راجا جی نے میرے سامنے ایک کسان سے کہا جا ہم تیرا لگان معاف کر دیتے ہیں۔''

''اس کے بعد جب وہ کسان چلا گیا تو انھوں نے منشی سے کہا! جا اس کسان کی زمین قُرق کرا لے۔''

''اس لیے محترم بزرگ میں سمجھتا ہوں کہ انسانوں کی دو زبانیں ہوتی ہیں اور وہ جو ایک زبان سے کہتے ہیں اسے دوسری زبان سے کاٹ دیتے ہیں اور پھر اس کا نام تہذیب رکھ دیتے ہیں۔''

کالے سر نے کہا ''شکر ہے ہم مینڈکوں کو صرف ایک زبان آتی ہے۔''

''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔'' بہت سے مینڈکوں نے ٹرّا کے کہا۔ دادا نے پوچھا ''اچھا یہ تو بتاؤ تم اس جہنم سے کیسے نکلے۔''

زرد پوش نے مسکرا کے کہا ''آہستہ آہستہ میں چھوٹے راج کمار سے مانوس ہوتا گیا کیونکہ وہ مجھے روز کھانے کھلاتا تھا۔ قدرتی بات تھی اس لیے اب مجھے اس کے جسم سے گھن بھی نہ آنے لگی تھی۔ نہ اب اس کے جسم کی بو مجھے ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ نہ اب مجھے اس کی ہتھیلی سے کراہت محسوس ہوتی تھی۔ میں اکثر اب اس کے کمرے میں پھُدکتا رہتا اور کمرے سے باہر نہ جاتا۔ راج کمار مجھ سے باتیں کرتا رہتا اور میں ٹرّا کے یا کبھی خاموش رہ کے اس کی باتیں سُنتا رہتا۔ پھر راج کمار مجھے اپنے ساتھ باہر بھی لانے لگا۔ ایک بار جب ہم دونوں ہی تالاب پر نہا رہے تھے تو رانی نے ہمیں دیکھ لیا اور وہ جو مجھے دیکھ کر چیخی ہے، جو چیخی ہے، جو چیخی ہے بس آسمان سر پر اٹھا لیا۔ تو صاحب اس رانی نے میرے پیچھے دو چار نوکر لگا دیے اور میں جو تالاب سے اُچھل کر بھاگا ہوں تو محل کے صحن کو پھاندتا ہوا برآمدوں میں سے جست لگاتا ہوا باہر باغیچے میں آ گیا۔ آگے راستہ صاف تھا اور یہ تو تم جانتے ہو کہ دوڑنے میں، بھاگنے میں، چھلانگ لگانے میں، تیرنے میں انسان کبھی مینڈک کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔''

''نہ گانے میں؟ گانے کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے۔'' زرّافہ جو خود گانے کی بڑی ماہر تھی، سوال کرنے لگی۔

''گانے کی بات چھوڑ دو۔ یہ آدمی تو ایسے بے سُرے ہوتے ہیں کہ ساز کے بغیر گا ہی نہیں سکتے۔ گانا تو اب صرف مینڈکوں تک رہ گیا۔ اس آرٹ کے ہم ہی وارث رہ گئے ہیں۔''

''بے شک بے شک۔'' بہت سے مینڈک یکدم بول اُٹھے اور گانے لگے۔

''ہم مینڈک ہیں، ہم مینڈک ہیں، ہم مینڈک ہیں۔''

جب یہ ٹرّاہٹ ختم ہوئی تو چند لمحوں کے لیے مجلس میں سنّاٹا رہا۔ آخر میں دادا نے سوال کیا۔

''اور سب باتیں تو سُن چکے۔ اب ایک بات پوچھنی ہے۔ یہ امتیاز جو تم مینڈک اور انسان میں بھی دیکھ چکے ہو، تمھارا کیا خیال ہے انسان بڑا ہے یا مینڈک؟''

چندلمحوں کی خاموشی کے بعد زرد پوش نے اپنا جُھکا ہوا سر اُٹھا کے کہا ''انسان''

''وہ کیسے؟''

زرد پوش بولا ''میں نے اپنی حکایت کا آخری حصّہ تو سُنایا ہی نہیں، جب میں باغیچے میں پہنچ گیا تب تک بہت سے نوکر دَم چھوڑ چکے تھے۔ مجھے پکڑنے کی آس چھوڑ چکے تھے۔ مگر ایک سب سے چھوٹا راج کمار جو مجھ سے اس قدر مانوس ہو گیا تھا اب بھی میرے پیچھے پیچھے بھاگتا آتا تھا۔ وہ باغیچے سے لے کے ڈھلوان تک اور پھر ڈھلوان سے لے کے کیچڑ تک اور کیچڑ سے نیچے جھیل کے کنارے میرے پیچھے پیچھے بھاگتا ہوا آیا اور جب میں نے دھڑام سے جھیل میں چھلانگ لگائی اس وقت بھی وہ پانی کے کنارے اپنی دونوں باہیں پھیلائے مجھ سے ملتجیانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ آجاؤ، واپس آجاؤ، میرے پیارے مینڈک، میں اب تم کو کبھی ناراض نہیں کروں گا، میں تم کو بہت پیار کروں گا اور جس وقت وہ یہ کہہ رہا تھا اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس لیے انسان مینڈک سے بڑا ہے کیونکہ انسان روسکتا ہے اور مینڈک رو نہیں سکتا۔ انسان اپنی تمام بُری حرکتوں، بے وفائیوں، بدلگامیوں کے باوجود روسکتا ہے اور مینڈک رو نہیں سکتا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ انسان مینڈک سے بڑا ہے۔''

(کرشن چندر)

© NCERT not to be republished

مشق

• معنی یاد کیجیے

ضیافت	:	دعوت
گویا	:	جیسے
وحشی	:	جنگلی، غیر مہذّب
کلام	:	بات
ہڑبونگ	:	ہنگامہ، افراتفری
خاوند	:	شوہر
منتقل	:	ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا۔
قُرق کرنا	:	ضبط کر لینا
مانوس ہونا	:	گھُل مل جانا
کراہت	:	ناگواری
آسمان سر پر اُٹھانا (محاورہ)	:	بہت زیادہ شور مچانا
جَست	:	چھلانگ
وارِث	:	حق دار
ساز	:	باجا

© NCERT not to be republished

مجلس : محفل

امتیاز : فرق

حِکایت : ایسی کہانی جس میں نصیحت شامل ہو۔

دَم چھوڑنا (محاورہ) : ہمّت ہارنا

ملتجیانہ : التجا کے ساتھ، عاجزی کے ساتھ

بدلگامی : بے قابو، وہ حرکتیں جن سے روکنا مشکل ہو۔

• سوچیے اور بتائیے

1۔ مینڈک محل کے اندر کیسے پہنچا؟

2۔ مینڈک کی وجہ سے محل میں کیا ہنگامہ ہوا؟

3۔ مینڈک نے اپنے ساتھیوں کو انسان کی زبان کے بارے میں کیا بتایا؟

4۔ محل کے تالاب میں مینڈک کو دیکھ کر رانی نے کیا کیا؟

5۔ انسان کو مینڈک سے بڑا کیوں بتایا گیا ہے؟

© NCERT not to be republished

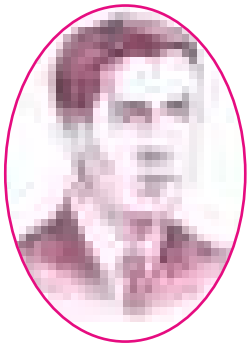

کرنل شفیق الرحمٰن

(1920 – 2000)

شفیق الرحمٰن کا پورا نام راؤ شفیق الرحمٰن تھا۔ وہ ضلع روہتک، ہریانہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام راؤ عبدالرحمٰن تھا۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد انھوں نے لاہور کے میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا۔ 1941 میں انڈین میڈیکل سروس میں بطور ڈاکٹر مقرر ہوئے۔ بعد میں ترقّی کر کے کرنل ہو گئے۔ فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد اکادمی ادبیاتِ پاکستان کے صدر رہے۔

شفیق الرحمٰن کا شمار اردو کے معروف مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی تحریریں شگفتہ اور رواں ہوتی ہیں۔ ہلکی پھلکی باتیں، نوعمر لڑکے لڑکیوں کی نادانیاں اور حماقتیں ان کے خاص موضوعات ہیں۔ شفیق الرحمٰن اپنے مزاحیہ مضامین میں افسانوی تکنیک کو بڑی خوبی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ ان مضامین میں جا بجا لطیفوں کو اس طرح شامل کیا گیا ہے جیسے وہ لطیفے نہیں اسی واقعے کا حصّہ ہیں۔

’کرنیں‘، ’شگوفے‘، ’لہریں‘، ’حماقتیں‘، ’مزید حماقتیں‘، ’دریچے‘ وغیرہ ان کے مزاحیہ مضامین کے مجموعے ہیں۔

© NCERT not to be republished

اَنکل فرینکی

سالانہ امتحان اِس قدر کٹھن اور طویل تھا کہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ جس دن امتحان ختم ہوا، میں نے بستر باندھا۔ ہوش آیا تو گُلمرگ میں تھا۔ ایک ہوٹل میں ٹھہرا۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو ایک بھی مانوس چہرہ نظر نہ آیا۔ بڑی مایوسی ہوئی۔ مجھے ان دنوں کرکٹ کا نیا نیا کلر ملا تھا۔ اس لیے بلیزر پہننے کا اتنا شوق تھا کہ میں اور کوئی کوٹ پہنتا ہی نہیں تھا۔ صبح صبح بلیزر پہن کر نکل جاتا اور سارا دن اِدھر اُدھر پھرتا رہتا۔ شام کو آتا، بلیزر اُتار کر سو جاتا۔

گلمرگ میں ایک روز دیکھتا کیا ہوں کہ بالکل سامنے پتھر پر ایک پُختہ عمر کا شخص بیٹھا ہے۔ اس کے مُنہ میں لمبا سا پائپ تھا اور ہاتھ میں مچھلیاں پکڑنے کی بنسی۔ اس کے چہرے پر بلا کی تازگی اور شگفتگی تھی۔ مسکراہٹ تھی کہ پھوٹی پڑتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تتلیاں پکڑنے کا جال، گردن میں کیمرہ اور تھیلا تھا۔ اس نے میرا بلیزر دیکھا۔

''یہ کرکٹ کا کلر تمھیں کب ملا؟''

''چند مہینے ہوئے''۔

''تب تو تم بہت اچھے کھلاڑی ہوگے۔ بولر ہو یا بیٹسمین؟''

''بولر ہوں''۔

''سِلو ہو یا فاسٹ؟''

''فاسٹ''۔

میں نے کلر جیتنے کی ساری داستان سنائی۔ اس نے بڑی دل چسپی سے سب کچھ سنا۔

© NCERT not to be republished

''مجھے بھی کرکٹ کا خبط ہے لیکن کبھی اسے سیکھ نہ سکا۔ مجھے بولنگ سیکھنے کا تو بے حد شوق ہے۔ کیا تم سکھا دو گے؟''
میں نے اس کی طرف دیکھا، بھلا اِس عمر میں بولنگ سیکھنے کا کیا فائدہ؟ لیکن بڑی سنجیدگی سے اس نے دوبارہ یہی سوال کیا۔

''آپ کو تھوڑی بہت تو آتی ہوگی؟''

''نہیں بالکل نہیں آتی لیکن سکھاؤ گے تو بہت جلد سیکھ جاؤں گا۔ میرے پاس چند بلّے اور گیندیں ہیں۔ جال اور وکٹیں یہاں نہ مل سکیں تو سری نگر سے منگا لیں گے''۔

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس نے بتایا کہ وہ آسٹریلیا سے یہاں گلمرگ میں اکیلا آیا ہے۔ اسے کرکٹ کا نہایت شوق ہے۔ اس نے انگلینڈ اور آسٹریلیا کے بڑے بڑے کرکٹ میچ دیکھے ہیں۔ کئی مشہور کھلاڑیوں کو جانتا بھی ہے۔

میں نے بریڈمین اور لِلی کے متعلق بے شمار سوالات کیے۔ پھر میں نے ہندوستانی کھلاڑیوں کی باتیں سنائیں۔

اگلے روز ہم اِکٹھے سیر کو گئے۔ دن بھر کرکٹ کی باتیں ہوتی رہیں۔ ہماری عمروں میں اس قدر نمایاں فرق تھا پھر بھی ہم اتنی جلدی بے تکلّف ہو گئے۔ شام کو ان کی چھوٹی سی کوٹھی میں چائے پی گئی۔ سامنے ایک باغیچہ اور میدان تھا۔

اس میں ہم نے جگہ منتخب کر لی۔ دیر تک زمین ہموار کرتے رہے۔ میں نے ان کا نام پوچھا۔ نام بتا کر کہا ''میرے دوست مجھے فرینکی کہتے ہیں۔ تم بھی فرینکی کہا کرو۔''

میں سوچنے لگا کہ فرینکی تو کوئی ہم عمر دوست ہوسکتا ہے۔ یہ مجھ سے بڑے ہیں۔ مجھے ان کا ادب کرنا چاہیے۔ آخر طے ہوا کہ میں اُنھیں انکل فرینکی کہا کروں۔

ہم نے دو دن صَرف کر کے کرکٹ کھیلنے کے لیے موزوں جگہ بنالی۔ جال لگایا، وکٹیں گاڑیں۔ سبق شروع ہوئے۔ میں نے گیند پکڑنے کا طریقہ بتایا۔ قدم گِن کر دکھائے۔ بازو گھما کر گیند پھینک کر دکھائی۔ جب وہ اچھی طرح سمجھ گئے،

تب ان سے کہا کہ اب آپ پھینکیے۔ میں بلّا لے کر وکٹوں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ان کی پہلی گیندیں جال سے باہر نکل گئیں۔ کئی میرے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ مجھے ان کے اسٹائل پر بڑی ہنسی آئی۔ یہ تو شاید ہی سیکھ سکیں۔

کئی دن تک یہی ہوتا رہا۔ حتّٰی کہ میں بالکل نا اُمّید ہو گیا لیکن ان کا جوش و خروش بدستور تھا۔ وہ الٹی سیدھی گیندیں پھینک کر قہقہے لگاتے، ہنستے ہنستے ان کا چہرہ گلابی ہو جاتا۔ وہ بے حد زندہ دل تھے۔ حالاں کہ ان کی عمر ایسی تھی کہ

انھیں کم گو ہو جانا چاہیے تھا لیکن نہ جانے کیوں ان کی ایک ایک حرکت میں بچپنا تھا۔ بات بات میں شوخی تھی، زندگی تھی۔ ہر روز ہم اکٹھے باہر جاتے، درختوں پر چڑھتے، پرندوں کے گھونسلوں سے رنگین انڈے اور پَر چُراتے، تتلیوں کا تعاقُب کرتے، خودرَو پھول توڑتے، بھاگ بھاگ کر بے حال ہو جاتے۔

شام کو کرکٹ شروع ہوتی۔ میں گیند پھینکنے کی قِسمیں بتاتا کہ کس موقع پر کیسی گیند پھینکنی چاہیے۔ اس کے بعد وہ عجیب اوٗٹ پٹانگ گیندیں پھینکنی شروع کرتے اور میں بھی ہنس ہنس کر دوہرا ہو جاتا۔

ایک شام کو فرینکی نے بتایا کہ نمائش دیکھنے سری نگر چلیں گے۔ ہم دونوں سری نگر گئے۔ ڈل میں ہاؤس بوٹ اور ایک چھوٹی سی کشتی بھی لی گئی۔ دن ڈھل چکا تھا۔ ساری وادی پر پیلی سی خوش گوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہم سڑکوں پر نکل آئے۔ سامنے گُلّی ڈنڈا ہو رہا تھا۔ انھوں نے پوچھا ''یہ کون سا کھیل ہے؟''

میں نے تفصیل بتائی۔ بولے ''نہایت دل چسپ کھیل ہے''۔

لڑکوں نے ہمیں کھیل میں شریک کر لیا۔ دیر تک گُلی ڈنڈا کھیلا۔ فرینکی بڑے اچھے کھلاڑی ثابت ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ کرکٹ سے بہت ملتا ہے۔

سری نگر سے واپسی کا پروگرام بنا۔ گُلمرگ پہنچ کر فرینکی نے ایسے زور و شور سے کرکٹ کھیلنا شروع کیا کہ ساری کسر نکل گئی۔ وہ بڑی محنت سے سبق سیکھتے۔ بڑی کوشش سے سبق یاد کرتے۔ سہ پہر سے شام تک بولنگ کرتے۔ ان کا کھیل

پہلے سے کچھ کچھ بہتر ہوتا جا رہا تھا۔ ایک روز وہ میرے پاس بیٹھ گئے۔ انھوں نے بڑی میٹھی میٹھی باتیں کیں۔ ان کے مسکراتے ہوئے چہرے پر ایسی شفقت تھی جیسے میں ان کا برسوں پرانا رفیق ہوں، ہماری عمروں میں کوئی فرق نہیں ہے اور ہم دونوں ہم عمر لڑکے ہیں۔ اس دن شام کو خوب بولنگ ہوئی۔ اب وہ سیدھی گیندیں پھینکنے لگے تھے۔ کبھی کبھار بریک بھی کرا لیتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے مجھے آؤٹ بھی کر دیا۔

رات میں روشنی کے سامنے انھوں نے ہاتھوں کے سائے سے جانور اور پرندے بنائے۔ تتلی، خرگوش، کُتّا، بطخ۔ میں نے بھی سیکھے۔ سایوں سایوں کی آپس میں جھوٹ موٹ کی لڑائیاں بھی ہوئیں۔

جب میں وہاں سے چلا تو مجھے چھوڑنے سری نگر تک آئے۔ انھوں نے مجھے اپنی تصویر دی جس پر لکھا تھا ''بے بی کے لیے، انکل فرینکی کی طرف سے''۔

علی الصّبح مجھے روانہ ہونا تھا۔ وہ رات ہم نے ڈَل کے کنارے ٹہل کر گزاری، خوب باتیں کیں۔ انھوں نے مجھے اپنی زندگی کے قصّے سنائے پھر بولے:

’’ کہنے کو تو میری عمر کافی ہے اور میں زندگی کا بیش تر حصّہ گزار چکا ہوں لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے زندگی ابھی ابھی شروع کی ہے۔ مجھے دنیا کی نفیس ترین چیزوں سے محبت ہے۔ ایک مخلص دوست میرے لیے سب سے بڑی نعمت ہے۔ میں صرف خلوص پر زندہ ہوں۔ یہی میری زندگی کا سرمایہ ہے۔

چلتے وقت میں نے وعدہ کیا کہ میں کبھی غمگین نہیں ہوں گا۔ ہمیشہ مسکراتا رہوں گا۔ کالج پہنچ کر میں نے ان کی باتیں دوستوں کو سنائیں۔ ان کے خط آتے رہے۔ کشمیر سے وہ کہیں اور جا رہے تھے۔

ایک روز کرکٹ میچ تھا۔ بلیزر کی جیب میں ان کی تصویر تھی۔ میں نے کھلاڑیوں کو دکھائی۔ ان میں سے چند تو چونک پڑے۔

’’ یہ تمھارے دوست کیسے بنے؟‘‘

میں نے انھیں بتایا کہ میں انھیں بولنگ سکھایا کرتا تھا۔ بڑی محنت کے بعد وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ سیدھی گیند پھینک سکیں۔

© NCERT not to be republished

''بولنگ سکھاتے تھے؟ ان کو؟''

''ہاں!''

''جانتے ہو یہ کون ہیں؟ آسٹریلیا کے مشہور و معروف بولر جو اپنے وقت میں دنیا کے بہترین بولر رہ چکے ہیں''۔

لیکن مجھے یقین نہیں آیا۔ پھر انھوں نے ایک کرکٹ کی کتاب میں فرینکی کی تصویر دکھائی۔

''لیکن میں نے سچ مچ انھیں بولنگ سکھائی تھی''۔

میرا خوب مذاق اُڑا۔ اس وقت میری سمجھ میں کچھ نہ آیا لیکن بعد میں سمجھا۔ اِس پُر رونق جگہ میں جس طرح میں تنہا اور اُداس تھا اسی طرح شاید فرینکی بھی تنہا اور اُداس تھے۔ شروع شروع میں کرکٹ ہی ایسا موضوع مل سکا جو ہم دونوں میں مشترک تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ ہمارے نظریے، ہمارے خیالات، ہمارے مشاغل یکساں تھے۔ ہمارے دل ہم عمر تھے۔

(شفیق الرحمٰن)

مشق

• معنی یاد کیجیے

کَلَر	:	کھلاڑیوں کو ملنے والے مخصوص رنگ
پُختہ	:	پکّا
شگفتگی	:	تروتازگی، شادابی
خبط	:	جنون کی حد تک شوق
نمایاں	:	صاف، ظاہر
ہموار	:	برابر
صَرف	:	خرچ

© NCERT not to be republished

موزوؤں	:	مناسب
حتّٰی کہ	:	یہاں تک کہ
بدستور	:	ہمیشہ کی طرح
کم گو	:	کم بولنے والا
شوخی	:	چُلبُلا پَن
تعاقُب کرنا	:	پیچھا کرنا
خودرَو	:	اپنے آپ اُگنے والا
کسر نکلنا	:	کمی پوری ہونا
شفقت	:	محبت، مہربانی
رفیق	:	دوست
علی الصّبح	:	صبح سویرے
بیش تر	:	زیادہ تر
نفیس ترین	:	سب سے عمدہ، نہایت ہی اچھا
مخلص	:	خلوص والا، بے غرض
سرمایہ	:	دولت
معروف	:	مشہور
مشترک	:	مِلا جُلا
یکساں	:	ایک جیسا
مشاغل	:	مشغلہ کی جمع، مصروفیت
ہم عمر	:	ایک ہی عمر کے

© NCERT not to be republished

• سوچیے اور بتائیے

1۔ مصنّف تمام دن بلیزر کیوں پہنے رہتا تھا؟

2۔ فرینکی سے مصنّف کی دوستی کس طرح ہوئی؟

3۔ اَنکل فرینکی نے بولنگ کس طرح سیکھی؟

4۔ کرکٹ کے علاوہ انکل فرینکی کی اور کیا سرگرمیاں تھیں؟

5۔ انکل فرینکی نے 'اپنی زندگی کا سرمایہ' کسے بتایا؟

6۔ مصنّف کے دوستوں نے اُس کا مذاق کیوں اُڑایا؟

© NCERT not to be republished

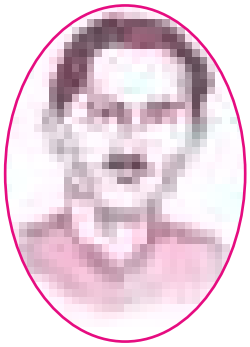

(1880 – 1936)

پریم چند

پریم چند بنارس کے قریب ایک گاؤں لمہی میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصلی نام دھنپت رائے تھا۔ ابتدا میں نواب رائے کے قلمی نام سے افسانے لکھے۔ بعد میں پریم چند کے نام سے مشہور ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسے میں ہوئی۔ اردو اور فارسی پڑھنے کے بعد انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔

پریم چند کا شمار اردو کے صفِ اوّل کے افسانہ اور ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں میں دیہاتی زندگی کے تمام پہلو اپنے مسائل کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

'پریم پچیسی'، 'پریم بتیسی'، 'واردات'، 'نجات' اور 'زادِ راہ' پریم چند کے افسانوں کے خاص مجموعے ہیں۔ ان کے ناولوں میں 'بازارِ حسن'، 'گوشۂ عافیت'، 'چوگانِ ہستی' اور 'میدانِ عمل' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ 'گئو دان' پریم چند کا شاہ کار ناول ہے۔ پریم چند کے یہاں وطن کی محبت اور سماج کی اصلاح کا جذبہ نمایاں ہے۔ ان کا اسلوب سادہ، سلیس اور پُر اثر ہے۔

© NCERT not to be republished

پوس کی رات

ہلکو نے آ کر اپنی بیوی سے کہا ''شہنا آیا ہے۔ لاؤ جو روپیے رکھے ہیں اسے دے دو۔ کسی طرح گردن تو چھوٹے۔''
مُنّی بہو جھاڑو لگا رہی تھی، پیچھے پھر کر بولی ''تین ہی تو روپیے ہیں۔ دے دوں تو کمبل کہاں سے آئے گا؟ ماگھ پوس کی رات کھیت میں کیسے کٹے گی۔ اُس سے کہہ دو کہ فصل پر روپے دے دیں گے، ابھی نہیں ہے۔''

ہلکو تھوڑی دیر تک چُپ کھڑا رہا اور اپنے دل میں سوچتا رہا پوس سر پر آ گیا۔ بغیر کمبل کے کھیت میں رات کو وہ کسی طرح سو نہیں سکتا۔ مگر شہنا مانے گا نہیں۔ گھُڑکیاں دے گا، گالیاں سنائے گا۔ بَلا سے جاڑوں مریں گے، یہ بَلا تو سر سے ٹل

جائے گی۔ یہ سوچتا ہُوا وہ اپنا بھاری جسم لیے ہوئے (جو اس کے نام کو غلط ثابت کر رہا تھا) اپنی بیوی کے پاس گیا اور خوشامد کر کے بولا ''لا، دے دے۔ گردن تو کسی طرح سے بچے۔ کمبل کے لیے کوئی دوسری تدبیر سوچوں گا۔''

مُنّی اس کے پاس سے دور ہٹ گئی اور آنکھیں ٹیڑھی کرتی ہوئی بولی ''کر چکے دوسری تدبیر۔ ذرا سُنوں کون سی تدبیر کرو گے؟ کون کمبل خیرات میں دے دے گا؟ نہ جانے کتنا روپیہ باقی ہے جو کسی طرح ادا ہی نہیں ہوتا۔ مَیں کہتی ہوں تم کھیتی کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ مر مر کر کام کرو، پیداوار ہو تو اس سے قرضہ ادا کرو۔ چلو چُھٹّی ہوئی۔ قرضہ ادا کرنے کے لیے تو ہم پیدا ہی ہوئے ہیں۔ ایسی کھیتی سے باز آئے۔ میں روپیے نہ دوں گی۔ نہ دوں گی۔''

ہلکو رنجیدہ ہو کر بولا ''تو کیا گالیاں کھاؤں؟''

مُنّی نے کہا ''گالی کیوں دے گا؟ کیا اس کا راج ہے؟'' مگر یہ کہنے کے ساتھ ہی اس کی تنی ہوئی بھویں ڈھیلی پڑ گئیں۔ ہلکو کی بات میں جو دِل ہلا دینے والی صداقت تھی، معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی جانب ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے طاق پر سے روپیے اُٹھائے اور لا کر ہلکو کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ پھر بولی ''تم اب کی کھیتی چھوڑ دو۔ مزدوری میں سُکھ سے ایک روٹی تو کھانے کو ملے گی۔ کسی کی دھونس تو نہ رہے گی۔ اچھّی کھیتی ہے مزدوری کر کے لاؤ وہ بھی اس میں جھونک دو۔ اُس پر سے دھونس!''

ہلکو نے روپیے لیے اور اس طرح باہر چلا کہ معلوم ہوتا تھا وہ اپنا کلیجہ نکال کر دینے جا رہا ہے۔ اس نے ایک ایک پیسہ کاٹ کر تین روپیے کمبل کے لیے جمع کیے تھے، وہ آج نکلے جا رہے ہیں۔ ایک ایک قدم کے ساتھ اس کا دماغ اپنی ناداری کے بوجھ سے دبا جا رہا تھا۔

پوس کی اندھیری رات۔ آسمان پر تارے بھی ٹھٹھُرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ہلکو اپنے کھیت کے کنارے اُوکھ کے پتّوں کی ایک چھتری کے نیچے بانس کے کھٹولے پر اپنی پُرانی گاڑھے کی چادر اوڑھے ہوئے کانپ رہا تھا۔ کھٹولے کے نیچے اُس کا ساتھی کُتّا 'جبرا' پیٹ میں مُنہ ڈالے سردی سے کوں کوں کر رہا تھا۔ دو میں سے ایک کو بھی نیند نہ آتی تھی۔

ہلکو نے گُھٹنوں کو گردن میں چمٹاتے ہوئے کہا ''کیوں جبرا، جاڑا لگتا ہے؟ کہا تو تھا گھر میں پیال پر لیٹ رہ۔ تو یہاں کیا لینے آیا تھا؟ اب کھا سردی، مَیں کیا کروں؟ جانتا تھا میں حلوہ پوری کھانے آ رہا ہوں۔ دوڑتے ہوئے

آگے چلے آئے۔ اب روؤ اپنی نانی کے نام کو۔'' جبرا نے لیٹے ہوئے دُم ہلائی اور ایک انگڑائی لے کر چُپ ہو گیا۔ شاید وہ یہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی کوں کوں کی آواز سے اس کے مالک کو نیند نہیں آ رہی ہے۔

ہلکو نے ہاتھ نکال کر جبرا کی ٹھنڈی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا'' کل سے میرے ساتھ نہ آنا، نہیں تو ٹھنڈے ہو جاؤ گے۔ یہ پچھوا ہَوا نہ جانے کہاں سے برف لیے آ رہی ہے۔ یہ کھیتی کا مزہ ہے۔ اور ایک ایک بھاگوان ایسے پڑے ہیں جن کے پاس اگر جاڑا جائے تو گرمی سے گھبرا کر بھاگے۔ موٹے گدّے، لحاف، کمبل، مجال ہے کہ جاڑے کا گزر ہو جائے۔ تقدیر کی خُوبی ہے مزدوری ہم کریں، مزہ دوسرے لوٹیں۔''

جبرا نے اُس کی جانب محبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ ہلکو نے کہا'' آج اور جاڑا کھا لے۔ کل سے مَیں یہاں پیال بچھا دوں گا۔ اس میں گھُس کر بیٹھنا جاڑا نہ لگے گا۔''

جبرا نے اگلے پنجے اس کے گھٹنوں پر رکھ دیے اور اس کے مُنہ کے پاس اپنا مُنہ لے گیا۔ ہلکو کو اس کی گرم سانس لگی۔ ہلکو پھر لیٹا اور یہ طے کر لیا کہ چاہے جو کچھ ہو اب کی سو جاؤں گا لیکن ایک لمحے میں اُس کا کلیجہ کانپنے لگا۔ کبھی اِس کروٹ لیٹا، کبھی اُس کروٹ۔ جاڑا کسی بھوت کی مانند اِس کی چھاتی کو دبائے ہوئے تھا۔

جب کسی طرح نہ رہا گیا تو اس نے جبرا کو دھیرے سے اٹھایا اور اس کے سر کو تھپ تھپا کر اسے اپنی گود میں سُلا لیا۔ کُتّے کے جسم سے معلوم نہیں کیسی بدبو آ رہی تھی، پر اسے اپنی گود سے چمٹاتے ہوئے ایسا سُکھ معلوم ہوتا تھا جو اِدھر مہینوں سے اسے نہ ملا تھا۔ جبرا شاید یہ خیال کر رہا تھا کہ بہشت یہی ہے اور ہلکو کی رُوح اِتنی پاک تھی کہ اُس کو کُتّے سے بالکل نفرت نہ تھی۔ وہ اپنی غریبی سے پریشان تھا جس کی وجہ سے وہ اِس حالت کو پہنچ گیا تھا۔ ایسی انوکھی دوستی نے اُس کی روح کے

سب دروازے کھول دیے تھے اور اس کا ایک ایک ذرّہ حقیقی روشنی سے منوّر ہو گیا تھا۔ اِسی اثنا میں جبرا نے کسی جانور کی آہٹ پائی۔ اس کے مالک کی اس خاص رؤ حانیت نے اس کے دِل میں ایک جدید طاقت پیدا کر دی تھی جو ہَوا کے ٹھنڈے جھونکوں کو بھی ناچیز سمجھ رہی تھی۔ وہ جھپٹ کر اٹھا اور چھپّری سے باہر آ کر بھونکنے لگا۔ ہلکو نے اسے کئی مرتبہ پُچکار کر بُلایا پر وہ اس کے پاس نہ آیا۔ کھیت میں چاروں طرف دوڑ دوڑ کر بھونکتا رہا۔ ایک لمحے کے لیے آ بھی جاتا تو فوراً ہی پھر دوڑتا۔ فرض کی ادائیگی نے اسے بے چین کر رکھّا تھا۔

ایک گھنٹہ گُزر گیا۔ سردی بڑھنے لگی۔ ہلکو اُٹھ بیٹھا اور دونوں گھُٹنوں کو چھاتی سے ملا کر سر کو چُھپا لیا۔ پھر بھی سردی کم نہ ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا خون مُنجمد ہو گیا ہے۔ اُس نے اُٹھ کر آسمان کی جانب دیکھا۔ ابھی کتنی رات باقی ہے۔ وہ سات ستارے جو قُطب کے گِرد گھومتے ہیں، ابھی اپنا نِصف دَورہ بھی ختم نہیں کر چکے۔ جب وہ اُوپر آ جائیں گے تو کہیں سویرا ہو گا۔ ابھی ایک گھڑی سے زیادہ رات باقی ہے۔

ہلکو کے کھیت سے تھوڑی دور کے فاصلے پر ایک باغ تھا۔ پت جھڑ شروع ہوگئی تھی۔ باغ میں پتّوں کا ڈھیر لگا ہُوا تھا۔ ہلکو نے سوچا چل کر پتیّاں بٹورؤں اور اُن کو جلا کر خوب تاپوں۔ رات کو کوئی مجھے پتّیاں بٹورتے دیکھے تو سمجھے کہ کوئی بھوت ہے۔ کون جانے کوئی جانور ہی چھُپا بیٹھا ہو مگر اب تو بیٹھے نہیں رہا جاتا۔

اس نے پاس کے ارہر کے کھیت میں جا کر کئی پودے اکھاڑے اور اس کا ایک جھاڑو بنا کر ہاتھ میں سُلگتا ہوا اُپلا لیے باغ کی طرف چلا۔ جبرا نے اسے جاتے دیکھا تو پاس آیا اور دُم ہلانے لگا۔

ہلکو نے کہا ''اب تو نہیں رہا جاتا۔ جبرؤ چلو، باغ میں پتّیاں بٹور کر تاپیں۔ ٹاٹھے ہو جائیں گے تو پھر آ کر سوئیں گے۔ ابھی تو رات بہت ہے۔''

جبرا نے کوں کوں کرتے ہوئے اپنے مالک کی رائے سے موافقت ظاہر کی اور آگے آگے باغ کی جانب چلا۔ باغ میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ درختوں سے شبنم کی بوندیں ٹپ ٹپ ٹپک رہی تھیں۔ یکا یک ایک جھونکا مہندی کے پھولوں کی خوشبو لیے ہوئے آیا۔

ہلکو نے کہا ''کیسی اچھی مہک آئی جبرا! تمھاری ناک میں بھی کچھ خوشبو آ رہی ہے؟''

جبرا کو کہیں زمین پر ایک ہڈّی پڑی مل گئی تھی وہ اسے چُوس رہا تھا۔ ہلکو نے آگ زمین پر رکھ دی اور پتّیاں بٹورنے لگا۔ تھوڑی دیر میں پتّیوں کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ ہاتھ ٹھٹھرتے جاتے تھے۔ ننگے پاؤں گلے جاتے تھے۔ اور وہ پتّیوں کا پہاڑ کھڑا کر رہا تھا۔ اسی الاؤ میں وہ سردی کو جلا کر خاک کر دے گا۔

تھوڑی دیر میں الاؤ جل اُٹھا۔ اس کی لَو اُوپر والے درخت کی پتّیوں کو چُھو چُھو کر بھاگنے لگی۔ اس متزلزل روشنی میں باغ کے عالی شان درخت ایسے معلوم ہوتے تھے کہ وہ اس لا انتہا اندھیرے کو اپنی گردن پر سنبھالے ہوں۔ تاریکی کے اِس اتھاہ سمندر میں یہ روشنی ایک ناؤ کے مانند معلوم ہوتی تھی۔

ہلکو الاؤ کے سامنے بیٹھا ہُوا آگ تاپ رہا تھا۔ ایک منٹ میں اُس نے اپنی چادر بغل میں دبالی اور دونوں پاؤں پھیلا دیے، گویا وہ سردی کو للکار کر کہہ رہا تھا ''تیرے جی میں جو آئے وہ کر''۔ سردی کی اس بے پایاں طاقت پر فتح پا کر وہ خوشی کو چھُپا نہ سکتا تھا۔

اُس نے جبرا سے کہا ''کیوں جبرا! اب تو ٹھنڈ نہیں لگ رہی ہے؟''

جبرا نے کوں کوں کر کے گویا کہا ''اب کیا ٹھنڈ لگتی ہی رہے گی۔''

''پہلے یہ تدبیر نہیں سُوجھی۔ نہیں اتنی ٹھنڈ کیوں کھاتے۔''

جبرا نے دُم ہلائی۔

''اچھّا آؤ اِس الاؤ کو کُود کر پار کریں۔ دیکھیں کون نکل جاتا ہے۔''

''اگر جل گئے بچّہ تو مَیں دوا نہ کروں گا۔''

جبرا نے خوف زدہ نگاہوں سے الاؤ کی جانب دیکھا۔

''مُنّی سے کل یہ نہ جڑ دینا کہ رات خوب ٹھنڈ لگی اور تاپ تاپ کر رات کاٹی۔ ورنہ لڑائی کرے گی۔''

یہ کہتا ہُوا وہ اُچھلا اَور اُس الاؤ کے اُوپر سے صاف نکل گیا۔ پیروں میں ذرا سی لَپٹ لگی پر وہ کوئی بات نہ تھی۔ جبرا الاؤ کے گرد گھوم کر اُس کے پاس آ کھڑا ہُوا۔

ہلکو نے کہا ''چلو چلو اُس کی سہی نہیں۔ اُوپر سے کود کر آؤ۔''

وہ پھر کودا اور الاؤ کے اُس پار آ گیا۔

پتّیاں جل چُکی تھیں۔ باغیچے میں پھر اندھیرا چھا گیا تھا۔ راکھ کے نیچے کچھ کچھ آگ باقی تھی جو ہَوا کا جھونکا آنے پر ذرا جاگ اُٹھتی تھی پر ایک لمحہ میں پھر آنکھیں بند کر لیتی تھی۔

ہلکو نے پھر چادر اوڑھ لی اور گرم راکھ کے پاس بیٹھا ہُوا ایک گیت گُنگُنانے لگا۔ اُس کے جسم میں گرمی آ گئی تھی پر جوں جوں سردی بڑھتی جاتی تھی اسے سُستی دبائے لیتی تھی۔

دفعتاً جبرا زور سے بھونک کر کھیت کی طرف بھاگا۔ ہلکو کو ایسا معلوم ہُوا کہ جانوروں کا ایک غول اس کے کھیت میں آیا۔ شاید نیل گایوں کا جُھنڈ تھا۔ اُن کے کُودنے اور دوڑنے کی آوازیں صاف کان میں آ رہی تھیں۔ پھر ایسا معلوم ہوا کہ وہ کھیت میں چر رہی ہیں۔

اُس نے دل میں کہا ''نہیں، جبرا کے ہوتے ہوئے کوئی جانور کھیت میں نہیں آ سکتا۔ نوچ ہی ڈالے۔ مجھے وہم ہو رہا ہے۔ کہاں! اب تو کچھ سُنائی نہیں دیتا۔ مجھے بھی کیسا دھوکا ہُوا!''

اُس نے زور سے آواز لگائی۔ ''جبرا! جبرا!''

جبرا بھونکتا رہا۔ اُس کے پاس نہ آیا۔

جانوروں کے چرنے کی آواز چَر چَر سنائی دینے لگی۔ ہلکو اب اپنے کو فریب نہ دے سکا۔ مگر اُسے اِس وقت اپنی جگہ سے ہِلنا زہر معلوم ہوتا تھا۔ کیسا گرمایا ہُوا مزے سے بیٹھا تھا۔ اِس جاڑے پالے میں کھیت میں جانا جانوروں کو بھگانا، ان کا تعاقب کرنا اُسے پہاڑ معلوم ہوتا تھا۔ اپنی جگہ سے نہ ہِلا۔ بیٹھے بیٹھے جانوروں کو بھگانے کے لیے چلاّنے لگا۔

''لِہو، لِہو، ہو، ہو، ہاہا ــــ''

مگر جبرا پھر بھونک اُٹھا۔ اگر جانور بھاگ جاتے تو وہ اب تک لَوٹ آیا ہوتا۔ نہیں بھاگے۔ ابھی تک چر رہے ہیں۔ شاید وہ سب بھی سمجھ رہے ہیں کہ اس سردی میں کون بیدھا ہے جو اُن کے پیچھے دوڑے گا۔ فصل تیار ہے۔ کیسی اچھّی کھیتی تھی۔ سارا گاؤں دیکھ دیکھ کر جلتا تھا۔ اُسے یہ ابھاگے تباہ کیے ڈالتے ہیں!

اب ہلکو سے نہ رہا گیا۔ وہ پکّا ارادہ کر کے اُٹھا اور دو تین قدم چلا۔ پھر یکا یک ہَوا کا ایسا ٹھنڈا، چبھنے والا، بچّھو کے ڈنک کا سا جھونکا لگا کہ وہ پھر بجُھتے ہوئے الاؤ کے پاس آ بیٹھا اور راکھ کو کُرید کُرید کر اپنے ٹھنڈے جسم کو گرمانے لگا۔

جبرا اپنا گلا پھاڑے ڈالتا تھا۔ نیل گائیں کھیت کا صفایا کیے ڈالتی تھیں اور ہلکو گرم راکھ کے پاس بے حِس بیٹھا ہُوا تھا۔ افسردگی نے اُسے چاروں طرف سے رسّی کی طرح جکڑ رکھا تھا۔

آخر وہیں چادر اوڑھ کر سو گیا۔

سویرے جب اُس کی نیند کھلی تو دیکھا چاروں طرف دھوپ پھیل گئی ہے اور مُنّی کھڑی کہہ رہی ہے ''کیا آج سوتے ہی رہو گے۔ تم یہاں میٹھی نیند سو رہے ہو اور اُدھر سارا کھیت چَوپٹ ہو گیا۔'' سارے کھیت کا ستیاناس ہو گیا۔ بھلا کوئی ایسا بھی سوتا ہے۔ تمھارے یہاں مَنڈیا ڈالنے سے کیا ہُوا؟

ہلکو نے بات بنائی۔ ''مَیں مرتے مرتے بچا، تجھے اپنے کھیت کی پڑی ہے۔ پیٹ میں ایسا درد اُٹھا تھا کہ میں ہی جانتا ہوں۔''

دونوں پھر کھیت کے ڈانڈ پر آئے۔ دیکھا کھیت میں ایک پودے کا نام نہیں اور جبرا مَنڈیا کے نیچے چِت پڑا ہے گویا بدن میں جان ہی نہیں ہے۔

دونوں کھیت کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مُنّی کے چہرے پر اُداسی چھائی ہوئی تھی، پر ہلکو خوش تھا۔

مُنّی نے فکرمند ہو کر کہا ''اب مجوری کر کے مال گُجاری دینی پڑے گی۔''

ہلکو نے مستانہ انداز سے کہا ''رات کو ٹھنڈ میں یہاں سونا تو نہ پڑے گا۔''

''میں اس کھیت کا لگان نہ دوں گی۔ کہے دیتی ہوں۔ جینے کے لیے کھیتی کرتے ہیں۔ مرنے کے لیے نہیں کرتے۔''

''جبرا ابھی تک سویا ہُوا ہے۔ اِتنا تو کبھی نہ سوتا تھا۔''

''آج جا کر سہنا سے کہہ دے کھیت جانور چر گئے۔ ہم ایک پیسہ نہ دیں گے۔''

''رات بڑے گجب کی سردی تھی۔''

''میں کیا کہتی ہوں۔ تم کیا سنتے ہو۔''

''تو، گالی کھِلانے کی بات کہہ رہی ہے۔ سہنا کو اِن باتوں سے کیا سروکار۔ تمھارا کھیت چاہے جانور کھائیں، چاہے آگ لگ جائے، چاہے اَولے پڑ جائیں، اسے تو اپنی مال گُجاری چاہیے۔''

''تو چھوڑ دو کھیتی۔ میں ایسی کھیتی سے باز آئی۔''

ہلکو نے مایوسانہ انداز سے کہا ''جی میں تو میرے بھی یہی آتا ہے کہ کھیتی باڑی چھوڑ دوں۔ مُنّی تجھ سے سچ کہتا ہوں مگر مجوری کا کھیال کرتا ہوں تو جی گھبرا اٹھتا ہے، کسان کا بیٹا ہوکر اب مجوری نہ کروں گا۔ چاہے کتنی ہی دُرگت ہوجائے۔ کھیتی کا مرجادنہ بگاڑوں۔''

''جبرا! جبرا! کیا سوتا ہی رہے گا؟ چل گھر چلیں۔''

(پریم چند)

مشق

• معنی یاد کیجیے

گردن چھوٹنا (محاورہ)	:	چھٹکارا پانا
ماگھ، پوس	:	ہندوستانی کیلنڈر کے وہ مہینے جن میں بہت سردی پڑتی ہے۔
گھُڑکیاں دینا	:	بُرا بھلا کہنا، ڈانٹ ڈپٹ کرنا
بَلا سر سے ٹلنا (محاورہ)	:	مصیبت دور ہونا
تدبیر	:	طریقہ
باز آنا (محاورہ)	:	بچنا
رنجیدہ	:	اُداس
طاق	:	دیوار میں بنا ہوا خانہ
ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا (محاورہ)	:	لگاتار دیکھنا

© NCERT not to be republished

ناداری	:	غریبی
اوٗکھ	:	گنّا
پَیال	:	پھوس، دھان کا سوکھا ڈنٹھل
مجال	:	ہمّت، حوصلہ
مانند	:	طرح
مُنوّر	:	روشن، چمک دار
اَثنا	:	بیچ، دوران
روحانیت	:	روح سے متعلق
منجمد ہونا	:	جم جانا
قُطْبْ	:	شمال میں ایک روشن ستارہ
نِصف	:	آدھا
ٹاٹھے ہوجانا	:	طاقت آنا، جان آجانا
اِتّفاق کرنا	:	ماننا
لاانتہا	:	جس کی کوئی حد نہ ہو
اَتھاہ	:	گہرا
بے پایاں	:	بہت زیادہ، بے حد
فَتْح	:	جیت
دفعتاً	:	اچانک
غول	:	جُھنڈ، ٹولی
افسردگی	:	اُداسی
مَنڈیا	:	کھیت میں بنا ہوا چھپّر

© NCERT not to be republished

• سوچیے اور بتائیے

1۔ 'مُنّی' نے ہلکو سے کھیتی چھوڑنے کے لیے کیوں کہا؟

2۔ پوس کی اندھیری رات میں ہلکو اور جبرے کی کیا حالت تھی؟

3۔ ہلکو نے سردی سے بچنے کے لیے کیا تدبیر کی؟

4۔ کھیت میں اچانک کیا واقعہ پیش آیا؟

5۔ سارے کھیت کا ستیاناس ہو جانے کے باوجود ہلکو نے کیا فیصلہ کیا؟

© NCERT not to be republished

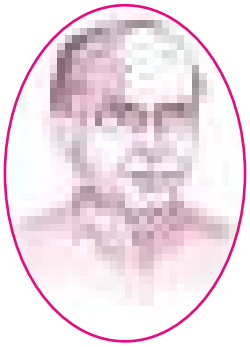

مشتاق احمد یوسفی

(1923)

مشتاق احمد یوسفی ٹونک، راجستھان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ تقسیمِ وطن کے بعد پاکستان منتقل ہو گئے۔ وہ ہمارے دَور کے مشہور طنز و مزاح نگار ہیں۔ ان کے مزاحیہ مضامین اپنے دل چسپ اندازِ بیان کی وجہ سے بہت مقبول ہیں۔ وہ الفاظ سے مزاح پیدا کرنے کے فن میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کی ظرافت میں طنز کی گہرائی ہے۔ اپنے اس طنز کو انھوں نے 'میٹھی مار' کا نام دیا ہے۔ بات میں بات پیدا کرنے کے علاوہ اشعار اور مصرعوں کے برمحل اور برجستہ استعمال سے ہنسنے ہنسانے کا سلیقہ انھیں خوب آتا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں میں ایسی اپنائیت ہوتی ہے کہ قاری بلا تکلُّف اُن کے قہقہوں میں شریک ہو جاتا ہے۔ مگر وہ صرف ہنساتے نہیں ہمارے فکر و شعور کو بھی بیدار کرتے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی الفاظ کے مزاج داں ہیں۔ لہجے کے اُتار چڑھاؤ اور نزاکتوں سے بھی خوب کام لیتے ہیں۔ 'چراغ تلے'، 'خاکم بہ دہن'، 'زرگزشت' اور 'آبِ گُم' ان کی معروف کتابیں ہیں۔

زیرِ نظر مضمون میں یوسفی نے کھانا پکانے کے ہنر کو ایک 'فن' قرار دیا ہے۔ انھوں نے مزاح کے طور پر ''فنونِ لطیفہ'' میں لفظی ردّ و بدل کر کے 'جنونِ لطیفہ' کر دیا ہے۔

© NCERT not to be republished

جنونِ لطیفہ

بڑا مبارک ہوتا ہے وہ دن جب کوئی نیا باورچی گھر میں آئے اور اس سے بھی زیادہ مبارک دن جب وہ چلا جائے۔ اطمینان کا سانس لینا بقولِ شاعر، صرف دو ہی موقعوں پر نصیب ہوتا ہے:

اِک ترے آنے سے پہلے اک ترے جانے کے بعد

خود کام کرنا بہت آسان ہے مگر دوسروں سے کام لینا نہایت دشوار ہے۔ اب اسے ہماری نااہلی کہیے یا کچھ اور کہ کوئی خانساماں ایک ہفتے سے زیادہ نہیں ٹِکتا۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ ہنڈیا اگر شبراتی نے چڑھائی تو بگھار رمضانی نے دیا اور دال بُلاقی خاں نے۔

مقصد اُن باورچیوں کا تعارف کرانا ہے جن کی خدمت کرنے کا شَرَف ہمیں حاصل ہو چکا ہے۔ اگر ہمارے لہجے میں کہیں تلخی آ جائے تو معاف فرمائیں۔

کچھ دن ہوئے ایک مڈل فیل خانساماں ملازمت کی تلاش میں آنکلا اور آتے ہی ہمارا نام اور پیشہ پوچھا۔ پھر سابق خانساماؤں کے پتے دریافت کیے اور یہ کہ آخری خانساماں نے ملازمت کیوں چھوڑی؟ باتوں باتوں میں یہ بھی کہ ہم ہفتے میں کتنی دفعہ باہر مَدعو ہوتے ہیں اور باورچی خانے میں چینی کے برتنوں کے ٹوٹنے کی آواز سے ہمارے اعصاب اور اخلاق پر کیا اثر مرتّب ہوتا ہے۔

ہمیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ہم میں وہی خوبیاں تلاش کر رہا ہے جو ہم اُس میں ڈھونڈ رہے تھے۔ یہ آنکھ مچولی ختم ہوئی اور کام کے اوقات کا سوال آیا تو ہم نے کہا کہ اصولاً ہم محنتی آدمی پسند کرتے ہیں۔ خود بیگم صاحبہ صبح پانچ بجے سے رات کے دس بجے تک گھر کے کام میں لگی رہتی ہیں۔ کہنے لگے، صاحب ان کی بات چھوڑیے وہ تو گھر کی مالک ہیں،

میں تو نوکر ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے یہ وضاحت بھی کر دی کہ برتن نہیں مانجھوں گا، جھاڑو نہیں دوں گا، ایش ٹرے صاف نہیں کروں گا، میز نہیں لگاؤں گا، دعوتوں میں ہاتھ نہیں دھلاؤں گا۔ ہم نے گھبرا کر پوچھا ''پھر کیا کرو گے؟''

''یہ تو آپ بتائیے۔ کام آپ کو لینا ہے، میں تو تابع دار ہوں۔''

جب سب باتیں طے ہو گئیں تو ہم نے ڈرتے ڈرتے کہا: بھئی سودا سلف لانے کے لیے فی الحال کوئی علیحدہ نوکر نہیں ہے اس لیے کچھ دن تمھیں سودا بھی لانا پڑے گا۔ تنخواہ طے کر لو۔ فرمایا: ''جناب تنخواہ کی فکر نہ کیجیے۔ پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ کم تنخواہ میں بھی خوش رہوں گا۔'' ''پھر بھی؟'' کہنے لگے! ''پچھتّر روپے ماہوار ہوگی لیکن اگر سودا بھی لانا پڑا تو چالیس روپے۔''

ان کے بعد ایک ڈھنگ کا باورچی آیا مگر بے حد دماغ دار معلوم ہوتا تھا۔ ہم نے اس کا پانی اتارنے کی غرض سے پوچھا: ''مُغلئی اور انگریزی کھانے آتے ہیں؟''۔ ''ہر قسم کا کھانا پکا سکتا ہوں۔ حضور کا کس علاقے سے تعلق تھا؟''

ہم نے صحیح صحیح بتا دیا۔ جھوم ہی تو گئے ۔ کہنے لگے : '' میں بھی ایک سال اُدھر کاٹ چکا ہوں ۔ وہاں کے باجرے کی کھچڑی کی تو دوٗر دوٗر تک دُھوم ہے۔'' لہٰذا اُنھوں نے کہا: '' میں نے بارہ سال انگریزوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں اس لیے اُکڑوں بیٹھ کر چولھا نہیں جھونکوں گا۔'' مجبوراً کھڑے ہوکر پکانے کا چولھا بنوایا۔

ان کے بعد جو خانساماں آیا، اس نے کہا'' میں چپاتیاں بیٹھ کر پکاؤں گا مگر بُرادے کی انگیٹھی پر۔'' چنانچہ لوہے کی انگیٹھی بنوائی۔ تیسرے کے لیے چکنی مٹّی کا چولھا بنوانا پڑا۔ چوتھے کے مطالبے پر مٹّی کے تیل سے جلنے والا چولھا خریدا اور پانچواں خانساماں اتنے سارے چولھے دیکھ کر ہی بھاگ گیا۔ اُس ظالم کا نام یاد نہیں آ رہا۔ البتّہ صورت اور خَد وخال اب تک یاد ہیں۔ وہ اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاتا تھا۔ آخر ایک دن ہم سے نہ دیکھا گیا اور ہم نے سختی سے ٹوکا کہ گھر کا کھانا کیوں نہیں کھاتے ؟ تنک کر بولا'' صاحب ہاتھ بیچا ہے زبان نہیں۔'' اس نے نہایت مختصر الفاظ میں یہ واضح کر دیا کہ اگر اسے اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانے پر مجبور کیا تو فوراً استعفیٰ دے دے گا۔ اُس کے اِس رویّے سے ہمیں شُبہ ہونے لگا کہ وہ واقعی خراب کھانا پکاتا ہے۔

گزشتہ سال ہمارے حال پر رحم کھا کر ایک کرم فرما نے ایک تجربہ کار باورچی بھیجا جو ہر علاقے کے کھانے پکانا جانتا تھا۔ ہم نے کہا: '' بھئی اور سب تو ٹھیک ہے مگر سات مہینے میں دس ملازمتیں چھوڑ چکے ہو، یہ کیا بات ہے؟'' کہنے لگے: '' صاحب! آج کل وفادار مالک کہاں ملتا ہے؟'' اس کی بدولت ہر خطّے بلکہ ہر تحصیل کے کھانے کی خوبیاں دسترخوان پر سمٹ کر آ گئیں۔ مثلاً دوپہر کے کھانے پر دیکھا کہ شوربے میں کیری ہچکولے لے رہی ہے اور سالن اس قدر تُرش ہے کہ آنکھیں بند ہو جائیں اور اگر بند ہوں تو پَٹ سے کُھل جائیں۔

ایک اور باورچی کا قِصّہ بھی سن لیجیے، جس کو ہم سب آغا کہا کرتے تھے۔ جس دن سے انھوں نے باورچی خانہ سنبھالا، گھر میں حکیم ڈاکٹروں کی ریل پیل ہونے لگی۔ یوں بھی ان کا پکایا ہوا کھانا دیکھ کر سر (اپنا) پیٹنے کو جی چاہتا ہے لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کو کیوں کر رخصت کیا جائے۔ ایک دن بولے: '' تم روز روز بیمار ہوتا اے...... اس سے ہمارے قبیلے میں بڑی رسوائی ہوتی ہے اور ہمارا خانہ خراب ہو جاتا ہے۔'' اس کے بعد انھوں نے کہا سنا معاف کرایا اور بغیر تنخواہ لیے چل دیے۔ ایسی ہی ایک دعوت کا ذکر ہے جس میں چند اَحباب مدعو تھے۔ نئے خانساماں نے

جوقورمہ پکایا اس میں شوربے کا یہ عالَم تھا کہ ناک پکڑ کر غوطہ لگائیں تو شاید کوئی بوٹی ہاتھ آجائے۔ اِکّا دُکّا کہیں نظر آ بھی جاتی تو کچھ اس طرح کہ:

صاف چُھپتی بھی نہیں سامنے آتی بھی نہیں

جناب نے مشورہ دیا کہ ریفریجریٹر خرید لو، روز روز کی جِھک جِھک سے نجات مل جائے گی۔ ایک دن لذیذ کھانا پکوالو اور ہفتے بھر ٹھاٹ سے کھاؤ اور کھلاؤ۔ قسطوں پر ریفریجریٹر خریدنے کے بعد ہمیں واقعی بڑا فرق محسوس ہوا اور وہ فرق یہ ہے کہ پہلے جو بدمزہ کھانا صرف ایک ہی وقت کھاتے تھے اب اسے ہفتے بھر کھانا پڑتا ہے۔

(مشتاق احمد یوسفی)

© NCERT not to be republished

مشق

• معنی یاد کیجیے

بقولِ شاعر	:	شاعر کے کہنے کے مطابق
نااہلی	:	نالائقی
خانساماں	:	باورچی
شَرَف	:	عزت، فخر
تلخی	:	کڑواہٹ
سابق	:	پچھلا
مدعو ہونا	:	بلایا جانا
اعصاب	:	رگ پٹھے
تابع دار	:	حکم ماننے والا
سودا سلف	:	بازار سے خریدی جانے والی مختلف چیزیں
دماغ دار	:	گھمنڈی، تیز دماغ والا
پانی اتارنا (محاورہ)	:	غرور کم کرنا
جوتیاں سیدھی کرنا (محاورہ)	:	خدمت کرنا
مطالبہ	:	مانگ، درخواست
خدوخال	:	چہرہ مہرہ

© NCERT not to be republished

اِستعفیٰ دینا	:	نوکری چھوڑنا
گزشتہ	:	گزرا ہوا، پچھلا
کرم فرما	:	مہربان
خِطّہ	:	علاقہ
تُرش	:	کھٹّا
ریل پیل	:	بہت زیادہ آمد و رفت
رُخصت	:	چھٹّی
رسوائی	:	بے عزّتی
احباب	:	دوست
غوطہ	:	ڈُبکی

• سوچیے اور بتائیے

1۔ مصنّف کو اطمینان کا سانس لینا کب نصیب ہوتا ہے؟

2۔ مصنّف نے مڈل فیل خانساماں کی کیا خصوصیات بیان کی ہیں؟

3۔ ''ہاتھ بیچا ہے زبان نہیں۔'' خانساماں نے یہ کیوں کہا؟

4۔ مصنّف نے ایک تجربہ کار باورچی کے تُرش کھانوں سے متعلّق کیا کہا ہے؟

5۔ ریفریجریٹر خریدنے کے بعد مصنّف کو کیا فرق محسوس ہوا؟

© NCERT not to be republished

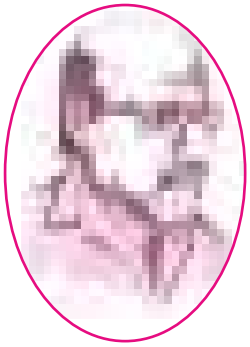

ابراہیم یوسف

(1921 – 2001)

اصل نام محمد ابراہیم خاں، قلمی نام ابراہیم یوسف تھا۔ بھوپال کے ایک معزز پٹھان خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم بھوپال میں اور اعلیٰ تعلیم اندور میں حاصل کی۔ زمانۂ طالب علمی سے ہی افسانہ لکھ کر ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ محکمۂ تعلیمات حکومت مدھیہ پردیش سے وابستہ رہے اور پرنسپل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

ان کا اصل میدان ڈراما نگاری ہے۔ ان کے ڈراموں کے سات مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں 'سوکھے درخت'، 'دھوئیں کے آنچل'، 'پانچ چھے ڈرامے' اہم ہیں۔ ایک ناول 'آبلے اور منزلیں' شائع ہوا۔ ڈرامے کے فن اور تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی اور اس سے متعلق کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انھوں نے ڈیڑھ سو سے زیادہ اردو یک بابی ڈرامے تحریر کیے ہیں۔ ان کے بعض ڈرامے بھوپال، اندور اور ممبئی میں اسٹیج کیے جا چکے ہیں۔

ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں مدھیہ پردیش حکومت کا 'اقبال سمان' 'میر تقی میرؔ ایوارڈ' اور ایوانِ غالب کا 'غالبؔ ایوارڈ' دیا جا چکا ہے۔

© NCERT not to be republished

ٹیپو سلطان

کردار

سلطان	:	ابوالفتح فتح علی ٹیپو عرف ٹیپو سلطان
میر صادق بدرالزّماں حافظ پورنیّا	:	سلطان کے غدّار افسران
سیپو لالی سیّد غفّار	:	سلطان کے وفادار افسران
عبدالخالق معزّ الدین	:	سلطان کے لڑکے

احمد خاں راجا خاں چوبدار نجومی برہمن لڑکی سپاہی وغیرہ

[پردہ اُٹھتا ہے]

سلطان کے محل سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا خیمہ جس کے سامنے کچھ کرسیاں پڑی ہیں۔ ایک کرسی پر ٹیپو سلطان، باقی پر سلطان کے کچھ افسر بیٹھے ہیں۔ کچھ سپاہی پہرے پر کھڑے ہیں۔ سلطان کسی کا انتظار کر رہا ہے۔ سلطان نظریں اٹھا کر سب لوگوں کی طرف دیکھتا ہے۔

© NCERT not to be republished

میر صادق : (کھڑے ہوکر) اعلیٰ حضرت میر قمرالدّین دشمن کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔

سلطان : انھوں نے دشمن کو راستے میں نہیں روکا، ان کی طرف سے ہمارا شک جائز ہے۔

میر صادق : شہزادہ فتح حیدر کے ساتھ بھی ایک بڑی فوج ہے۔ جوں ہی دشمن کی پشت پر آئیں گے ہم موت کے فرشتے بن کر دشمن پر ٹوٹ پڑیں گے۔

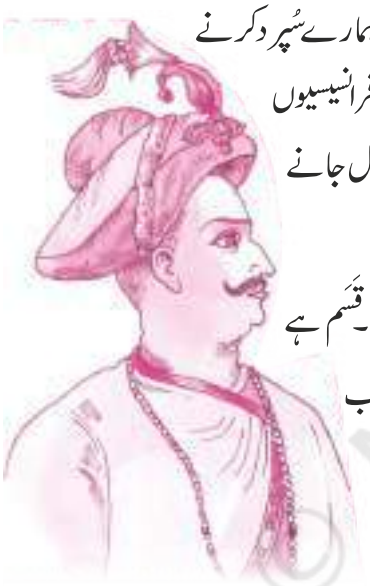

لالی : (نفرت سے میر صادق کو دیکھ کر) اگر قلعے کی حفاظت ہمارے سُپرد کرنے کی تجویز اعلیٰ حضرت کو پسند نہیں تو پھر بہتر ہے کہ ہم سب فرانسیسیوں کو پکڑ کر انگریزوں کے حوالے کر دیں۔ وہ ہمارے نکل جانے پر صُلح کی بات کریں گے، انھیں ہم سے ہی دشمنی ہے۔

سلطان : آپ اپنا وطن چھوڑ کر ہمارے بلانے پر یہاں آئے ہیں۔ قَسم ہے وحدۂ لاشریک کی اگر پوری سلطنت بھی تباہ ہوجائے تب بھی ہم ایسا نہیں کریں گے۔

[ایک چوبدار داخل ہوکر]

چوبدار : سلطان کا اقبال بلند ہو! (سلطان نظریں اٹھا کر چوبدار کو دیکھتا ہے) ایک برہمن نجومی اِسی وقت باریابی چاہتا ہے۔

سلطان : اجازت ہے۔ (چوبدار واپس چلا جاتا ہے سلطان، لالی اور سیپو کی طرف دیکھ کر) اگر ہم کو آپ جیسے چار وفادار مل جاتے تو خدا کی قسم ہم ہندوستانیوں کو فرنگیوں کی غلامی سے بچا لیتے۔ (کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد) سیپو، لالی یہ بہت نازک وقت ہے، ہمیں چوبیس گھنٹے مورچوں پر ہوشیار رہنا چاہیے۔

لالی : ہم مقدّس کنواری کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ جان دے دیں گے مگر غدّاری اور بے وفائی نہیں

کریں گے۔(لالی اور سیپو سلام کرتے ہیں اور تیز تیز قدموں سے چلے جاتے ہیں۔اُسی وقت چوبدار کے ساتھ نجومی آتا ہے اور جُھک کر سلام کرتا ہے)

نجومی : مہاراج کی جے ہو۔(کچھ دیر رُک کر) میری جوتش وِدّیا بتاتی ہے کہ آج کا دن اَن داتا کے لیے اَشُبھ ہے۔

سلطان : (کچھ خاموش رہ کر پُورنیّا کی طرف دیکھ کر) پٹّن کے سنیّاسی کو ایک ہاتھی، ایک تھیلا تِل اور دو سو روپے فوراً دے دیے جائیں۔

پورنیا : سلطان کا حکم سر آنکھوں پر، فوراً تعمیل کی جائے گی۔

سلطان : دیگر برہمنوں کو نوّے نوّے روپے، ایک سیاہ بیل، بکری، کپڑے اور تِل دینے کا انتظام کیا جائے۔

پورنیا : ابھی تعمیل کی جاتی ہے۔

سلطان : (نجومی کی طرف دیکھ کر) یہ منحوس دن گزر جانے پر تمھارا سلطان تمھیں مالا مال کر دے گا۔

[نجومی جھک کر سلام کرتا ہے اور چلا جاتا ہے]

بدرالزّماں : اِن لوگوں نے حالات کو دیکھ کر مبارک اور منحوس دن بھی بنا لیے ہیں۔

سلطان : یہ لوگ اپنے سلطان سے محبّت کرتے ہیں اور ان کی محبّت کی ہم قدر کرتے ہیں۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) آپ حضرات نے لالی اور سیپو کی تجویز کو سُنا۔ ہم آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

میر صادق : اعلیٰ حضرت! انگریز اور فرانسیسی ایک ہیں۔ اُن پر کیوں کر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔

سلطان : ہم قسم کھا کر کیے گئے وعدے پر اُسی طرح ایمان لے آتے ہیں جیسے ہمارا ایمان خدائے بزرگ اور برتر پر ہے۔ (سب سلام کر کے چلے جاتے ہیں۔ چوبدار کی طرف دیکھ کر) شہزادہ عبدالخالق اور شہزادہ معزالدّین کو فوراً بلایا جائے۔ (چوبدار سلام کر کے جاتا ہے کہ سیّد غفّار آتا ہے)

سیّد غفّار : اعلیٰ حضرت! فرنگی فوج میں ایسی ہلچل دیکھی جا رہی ہے کہ جیسے حملہ ہونے والا ہے۔

سلطان : دن میں حملہ ہوگا؟ (کچھ دیر سوچ کر) آپ مورچے پر مُستعد رہیے، ہم نے خاص طور پر آپ کی وفاداری کے باعث اس مورچے کی ذمّے داری آپ کو سونپی ہے۔

سیّد غفّار : (جوشیلے لہجے میں) اگر حضرت حکم فرمائیں تو غدّاروں کے سَر ابھی قدموں میں لا کر ڈال دوں۔

سلطان : (ٹھنڈی سانس بھر کر) جن غدّاروں کو ہم نے سانپ کی طرح دودھ پلا کر پالا ہے، ان کی بے وفائی کی انتہا بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ (دونوں شہزادے آتے ہیں اور سلام کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں، سیّد غفّار سلام کر کے چلا جاتا ہے، سلطان شہزادوں سے) ہم نے آپ کو بے حد اہم خدمات انجام دینے کے لیے بلایا ہے۔

مُعزِ الدّین : (سینہ پُھلا کر) جن کی رگوں میں حیدری خون دوڑ رہا ہے وہ اہم خدمات انجام دینے کے لیے ہی پیدا ہوئے ہیں۔

سلطان : آپ حیدر علی کے پوتے اور ٹیپو کی اولاد ہیں۔ ان دونوں نے مشکلات سے گھبرانا نہیں سیکھا۔

معزالدّین : شیر کی اولاد گیدڑ نہیں ہو سکتی۔ حکم فرمایئے، اس تلوار کے لیے کون سی خدمت ہے؟

سلطان : (مسکرا کر) فی الحال ہم آپ کو حرم سَرا اور محل کی حفاظت کی ذمّے داری سونپتے ہیں۔

[معزالدّین سلام کر کے چلا جاتا ہے]

عبدالخالق : (افسردہ لہجے میں) آج شہزادہ معزالدّین ہم سے بازی لے گئے۔

سلطان : (مسکرا کر) لیکن ہم اس سے بھی اہم خدمت آپ کے سپرد کریں گے۔

[اسی وقت ایک سپاہی آتا ہے اور سلام کر کے]

سپاہی : میں حضرت کو یہ بُری خبر سنانے کے لیے معافی چاہتا ہوں کہ سیّد غفّار دشمن کی گولی سے مارے گئے۔

سلطان : مارے نہیں گئے، شہید ہو گئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُوْن (سپاہی سے) اُس جگہ پر نشان لگا دیا جائے۔

(سپاہی سلام کر کے چلا جاتا ہے کھانا لگایا جاتا ہے۔ سلطان لقمہ اٹھاتا ہے کہ ایک سپاہی راجا خاں دوڑا ہوا آتا ہے)

راجا خاں : سلطان! فرنگی فوج دیوار کے شگاف سے اندر داخل ہو گئی ہے۔

سلطان : (ہاتھ سے لقمہ رکھتے ہوئے) سلطانی فوج نے اسے روکا نہیں!

راجا خاں : دیوان پورنیا نے تنخواہ تقسیم کرنے کے لیے ساری فوج کو مسجد اعلیٰ کے پاس بلا لیا ہے۔ وہاں ایک بھی سپاہی نہیں ہے۔

سلطان : (پاس رکھی ہوئی بندوق اٹھا کر) جن لوگوں نے یہ غدّاری کی ہے ان کی اولاد ایک ایک دانے کو ترسے گی۔

راجا خاں : حضرت سلطان کا مورچہ پر جانا مناسب نہیں ہے۔

سلطان : گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دِن کی زندگی بہتر ہے۔ (اور تیز تیز قدموں سے چلا جاتا ہے) راجا خاں بھی پیچھے پیچھے دوڑتا ہے۔ ایک دو سپاہی شہزادہ عبدالخالق کے پاس کھڑے رہ جاتے ہیں۔ ایک نوجوان لڑکی غصّے میں بھری ہوئی آتی ہے۔

لڑکی : شہزادے! میں ایک برہمن لڑکی ہوں، وطن پر فدا ہونے کے لیے مجھے ایک تلوار چاہیے۔ جب

محل کی بیگمات وطن پر فدا ہو رہی ہیں تو میں بھی پیچھے نہیں رہوں گی۔

(ایک سپاہی کی تلوار لے کر دوڑتی ہوئی چلی جاتی ہے)

عبدالخالق : جس ملک میں ایسی بہادر لڑکیاں ہوں وہاں (ایک سپاہی دوڑتا ہوا آتا ہے عبدالخالق اسے دیکھ کر)، کوئی خبر؟

سپاہی : سلطان نے فرنگی فوج کے بڑی دَل کو ڈوڈی دروازے کے پاس روک لیا ہے مگر کُمک کی فوری ضرورت ہے۔

عبدالخالق : مسجدِ اعلیٰ کے پاس جس قدر فوج ہے اس کو فوراً حضرت سلطان کی مدد کے لیے بھیج دیا جائے۔

سپاہی : مگر دیوان پورنیا نے ان سے ہتھیار چھین لیے ہیں۔

عبدالخالق : اسلحہ خانۂ سلطانی سے فوراً ہتھیار دے دیے جائیں (سپاہی سلام کر کے چلا جاتا ہے۔ احمد خاں سپاہی ننگی تلوار غصّے سے ہاتھ میں لیے آتا ہے۔ شہزادہ اس طرف دیکھتا ہے)

احمد خاں : غدّار، نمک حرام میر صادق نے ڈوڈی دروازہ بند کرا دیا ہے کہ حضرت سلطان اس دروازے سے واپس قلعے میں نہ آسکیں۔

عبدالخالق : (کچھ سوچ کر) فوج کو حکم دیا جائے کہ وہ کچّی فصیل سے نکلنے کے لیے بڑے دروازے کو استعمال کرے اور حضرت سلطان کو مدد پہنچائے۔ (احمد خاں غصّے میں بھاگتا ہوا جاتا ہے عبدالخالق ٹہلنے لگتا ہے۔)

[ایک سپاہی دوڑتا ہوا آتا ہے عبدالخالق کو سلام کر کے]

سپاہی : احمد خاں نے میر صادق کو قتل کر دیا۔ حضرت سلطان دست بدست جنگ کرتے ہوئے بڑے دروازے تک پیچھے ہٹ آئے ہیں لیکن تین طرف سے دشمن سے گھر گئے ہیں۔ قیامت کا رَن پڑ رہا ہے۔

عبدالخالق : (افسردہ لہجے میں) کاش! حضرت سلطان ہمیں ایک اہم خدمت سپرد نہ کرتے اور اس وقت ہم

ان پر اپنی جان قربان کر سکتے۔

سپاہی : شہزادے بہادر! آپ چند جاں نثاروں کے ساتھ قلعہ خالی کر دیں اور شہزادہ فتح حیدر کے پاس پہنچ کر جنگ جاری رکھیں۔

عبدالخالق : (غصّے سے) آج تک یہ نہیں سُنا کہ کوئی شیر مقابلے سے مُنہ موڑ کر فرار ہو گیا ہو۔ (بے چینی سے ٹہلنے لگتا ہے، پھر ٹھنڈی سانس بھر کر) اگر آج ہم ہار گئے تو پھر کوئی مسلمان کسی پورنیا کی حفاظت نہیں کرے گا اور نہ کوئی برہمن لڑکی کسی ٹیپو سلطان پر جان نثار کرنے کو بے تاب ہوگی۔

[بے چینی سے ٹہلنے لگتا ہے۔ ایک سپاہی زخموں سے چور آتا ہے]

سپاہی : منحوس خبر یہ ہے کہ (گر پڑتا ہے) عبدالخالق کو دیکھ کر پھر آنکھیں کھول کر۔ شہزادے! حضرت سلطان شہید ہو گئے اور میں حقِ نمک ادا نہ کر سکا۔

(اس کی گردن ایک طرف ڈھلک جاتی ہے۔ عبدالخالق آہستہ سے اُسے لٹا کر اور کھڑے ہو کر)

عبدالخالق : اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُوْن۔

[پردہ گرتا ہے]

مشق

• معنی یاد کیجیے

اعلیٰ حضرت	:	بڑے مرتبے والا (احترام کے طور پر بولتے ہیں)
پُشت	:	پیٹھ، پیچھے
دشمن پر ٹوٹ پڑنا (محاورہ)	:	ایک ساتھ حملہ کرنا
سُپرد کرنا	:	حوالے کرنا
تجویز	:	رائے، مشورہ
صُلح	:	میل ملاپ
وحدہٗ لاشریک	:	وہ اکیلا جس کا کوئی شریک نہیں، مُراد اللہ تعالیٰ
اقبال بلند ہونا (محاورہ)	:	مرتبہ بلند ہونا
سلطنت	:	شاہی حکومت
چوبدار	:	دربار میں آواز لگانے والا
مورچہ	:	جنگ کا میدان
نجومی	:	ستاروں کی چال دیکھ کر آگے کا حال بتانے والا
باریابی	:	خدمت میں حاضری، ملاقات
مُقدّس کنْواری	:	حضرت مریم کی طرف اشارہ ہے۔

© NCERT not to be republished

اَشُبھ	:	نامبارک
تعمیل کرنا	:	پورا کرنا، عمل کرنا
بزرگ و برتر	:	بڑا
مُستعِد	:	تیّار
حرم سَرا	:	شاہی بیگمات وخواتین کے رہنے کی جگہ
اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُوْن	:	بے شک ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف ہمیں لوٹنا ہے۔ (کسی پریشانی کے موقع پر بولا جانے والا کلمہ)
بِڈّی دَل	:	بہت بڑی تعداد
کُمک	:	فوجی مدد
اسلحہ خانہ	:	ہتھیار رکھنے کی جگہ
فصیل	:	قلعہ اور شہر کے گرد بنائی گئی دیوار
دست بدست	:	ہاتھوں ہاتھ
قیامت کا رَن پڑنا (محاورہ)	:	زبردست جنگ ہونا
فرار ہونا	:	بھاگ جانا

• سوچیے اور بتائیے

1۔ ٹیپوسلطان کا پورا نام کیا تھا؟

2۔ ٹیپوسلطان انگریزوں سے پوری زندگی کیوں لڑتا رہا؟

3۔ لالی نے ٹیپوسلطان کو اپنی وفاداری کا یقین کس طرح دلایا؟

© NCERT not to be republished

4۔ ٹیپوسلطان نے شہزادہ مُعزالدّین کو کیا خدمت سپرد کی؟

5۔ ''گیدڑ کی سوسالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔''اس جملے کا کیا مطلب ہے؟

6۔ میر صادق اور پورنیا کون تھے؟ انھوں نے ٹیپوسلطان سے کیا غدّاری کی؟

© NCERT not to be republished

قاضی عبدالغفّار

(1890 – 1956)

قاضی عبدالغفّار مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی اسکولوں میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ گئے جہاں ان کا ادبی اور سیاسی شعور پروان چڑھا۔

صحافت میں ان کی گہری دل چسپی تھی۔ ابتدا میں وہ مولانا محمد علی جوہرؔ کے مددگار کی حیثیت سے ان کے اخبار 'ہمدرد' (دہلی) سے وابستہ ہوئے۔ کچھ عرصے بعد کولکاتا چلے گئے۔ وہاں سے روزنامہ 'جمہور' پھر حیدرآباد سے 'پیغام' نکالا۔

'لیلیٰ کے خطوط' اور 'مجنوں کی ڈائری' ان کی اہم کتابیں ہیں۔ 'آثارِ جمال الدّین'، 'حیاتِ اجمل' اور 'یادگارِ ابوالکلام آزاد' ان کی لکھی ہوئی مشہور سوانح عُمریاں ہیں۔ انھوں نے ایک عرصے تک انجمن ترقی اردو (ہند) کے سکریٹری کی خدمت انجام دی اور انجمن کے ترجمان 'ہماری زبان' کے مدیر بھی رہے۔

© NCERT not to be republished

حکیم اجمل خاں

حکیم اجمل خاں 1863 میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ دہلی شہر کے نہایت ہی مشہور حکیم تھے۔ ان کی شہرت پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ حکیم اجمل خاں بڑے باکمال انسان تھے۔ ان کی ذہانت کا یہ عالَم تھا کہ بہت کم عمری میں انھوں نے قرآن حِفظ کرلیا۔ عربی اور فارسی کی تعلیم گھر پر ہی مکمّل کرلی۔ بچپن ہی سے کُتب بینی کا شوق تھا۔ گھنٹوں کتابیں پڑھتے رہتے، کھانے پینے کا بھی ہوش نہ رہتا۔ ان کے اس شوق کو دیکھ کر اُن کے والد پیار سے انھیں مُلّا پکارتے تھے۔ انھیں ورزش کا بھی شوق تھا۔ گھر ہی اکھاڑا تھا جہاں وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ورزش کیا کرتے تھے۔

حکیم اجمل خاں خاندانی حکیم تھے۔ ان کے والد حکیم محمود خاں نے طبِّ یونانی کو زندہ رکھنے کے لیے دہلی میں ایک طِبّیہ مدرسہ جاری کیا تھا جس میں یونانی طریقۂ علاج کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اُن کے انتقال کے بعد مدرسے کی ذمّے داری حکیم اجمل خاں پر آ گئی۔ انھوں نے اِس کی ترقّی کے لیے بڑی محنت اور جدّ وجہد کی اور اسے مدرسے سے کالج بنا دیا۔ اِس میں انھوں نے عورتوں کی تعلیم کے لیے علیحدہ شُعبہ بھی قائم کیا۔ حکیم صاحب نے کالج کے لیے اپنا ذاتی دواخانہ اور تمام اِملاک وَقف کردی اور اپنے خاندان والوں کے لیے کچھ نہ چھوڑا۔ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں دواخانے اور جائداد سے دو لاکھ روپے سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔ یہ پوری رقم طِبّیہ کالج پر صَرف ہوتی تھی۔ یہ اُن کے ایثار کی اَدنیٰ مثال ہے۔

حکیم صاحب کو تعلیم سے بے حد لگاؤ تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ تعلیم کے بغیر کوئی قوم ترقّی نہیں کرسکتی۔ مسلمانوں میں تعلیم کو فروغ دینے کے لیے انھوں نے سرسیّد کا پورا ساتھ دیا۔ حکیم صاحب کو اپنے وطن سے بے حد محبت تھی۔ وہ ملک کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے انگریزی حکومت کے ظلم وجَبر اور ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائی اور قومی تحریکوں میں

© NCERT not to be republished

بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ انھوں نے عدم تعاوُن کی تحریک میں گاندھی جی کا ساتھ دیا۔ ان کی قومی خدمات کے سبب انھیں کانگریس کا صدر بنایا گیا جو ہندوستانیوں کے لیے اس زمانے میں سب سے بڑا اعزاز تھا۔ عدم تعاون کی تحریک کے نتیجے میں مولانا محمد علی جوہرؔ، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور حکیم اجمل خاں کی کوششوں سے علی گڑھ میں ایک قومی دَرس گاہ 'جامعہ ملّیہ اسلامیہ' کے نام سے قائم ہوئی۔ بعد میں یہ درس گاہ دہلی منتقل ہوگئی۔ حکیم صاحب اس درس گاہ کے پہلے امیرِ جامعہ منتخَب ہوئے اور آخر دم تک اس عُہدے پر فائز رہے۔

حکیم صاحب کو ہندو مسلم اِتّحاد بڑا عزیز تھا۔ جہاں کہیں ان دونوں فِرقوں کے درمیان لڑائی جھگڑا ہوتا حکیم صاحب اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر وہاں پہنچ جاتے اور جب تک دونوں میں صلح صفائی نہ ہو جاتی وہاں سے واپس نہ آتے۔ وہ بڑے حوصلہ منداور باہمّت انسان تھے۔ سامنے کھڑی ہوئی موت کے مقابلے میں بھی اپنے چہرے پر شِکن نہ آنے دیتے۔

ایک بار شمالی ہند میں زبردست زلزلہ آیا۔ صبح کے وقت حکیم صاحب اپنے مَطَب میں مصروف تھے۔ جب زلزلے کے پَے در پَے جھٹکے محسوس ہوئے تو مریض اور حاضرین سراسیمہ اُٹھ کر بھاگے لیکن آدھے منٹ کے بعد جب لوگوں کو ہوش آیا تو انھوں نے دیکھا کہ حکیم صاحب بَدَستور اپنی جگہ بیٹھے ہیں۔ ان کے اِس ضبط و تحمّل نے بھاگنے والوں کو شرما دیا اور مَطَب کا کام ایک منٹ میں اس طرح جاری ہو گیا گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

غیرت اور خودداری کا یہ حال تھا کہ انتہائی انکسار کے باوجود جب عزّتِ نَفْس کا سوال آتا تو موم جیسی نرمی، فولاد کی طرح سخت ہو جاتی۔ ایک دفعہ رام پور سے تشریف لا رہے تھے اور مراد آباد اسٹیشن پر ٹرین میں اوّل درجے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بستر بچھایا جا چکا تھا۔ ابھی لیٹے نہ تھے کہ اس اوّل درجے کے ڈبّے میں ایک فرنگی تشریف لائے۔ وہ ایک ہندوستانی کو فرسٹ کلاس میں بیٹھے ہوئے دیکھ کر چیں بہ جَبیں ہوئے۔ جس برتھ پر حکیم صاحب کا بستر لگا ہوا تھا اس پر وہ خود قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے آتے ہی حکم دیا ''اُدھر جایئے گا۔'' وہ بار بار کہتے رہے لیکن حکیم صاحب خاموش رہے اور ٹَس سے مَس نہ ہوئے کیوں کہ اُن کے پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ تھا۔ اتنے میں انگریز کا ملازم سامان لے کر داخل ہوا اور جب دیکھا کہ صاحب بگڑ رہے ہیں تو آہستہ سے اُن کو بتایا کہ یہ دہلی کے مشہور و معروف حکیم صاحب ہیں جن کا چرچا سارے ہندوستان میں ہے۔ یہ سن کر صاحب نے فوراً اپنا رویّہ بدل دیا اور کہنے لگے ''حکیم صاحب! معاف فرمایئے۔

میں نے آپ کو پہچانا نہ تھا۔ میں بیمار ہوں اور داہنی کروَٹ سو نہیں سکتا۔ اس لیے آپ کے برتھ پر سونا چاہتا تھا۔''

حکیم صاحب نے فرمایا ''آپ نے گفتگو کا یہ طریقہ پہلے ہی کیوں نہ اختیار کیا۔ یہ معلوم کر کے کہ میں اجمل خاں ہوں آپ میرے ساتھ اخلاق بَرت رہے ہیں۔ مگر یہ دیکھ کر کہ میں ہندوستانی ہوں، آپ نے اخلاق کے ساتھ گفتگو کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اب میں یہ جگہ آپ کو ہرگز نہ دوں گا۔''

حکیم صاحب کی زندگی رئیسانہ تھی۔ اُن کی ٹکّر کا ہندوستان میں کوئی حکیم نہ تھا۔ نوابوں اور راجاؤں سے ماہوار ہزاروں کی رقمیں بندھی ہوئی تھیں۔ دہلی سے باہر جانے کی روزانہ ایک ہزار روپے فیس مقرّر تھی۔ لیکن اللہ نے انھیں ایک درد مند دل دیا تھا۔ وہ فقیرانہ طبیعت رکھتے تھے۔ دولت کی محبت ان کے دل میں جگہ نہ پا سکی۔ اُن کی نظر میں امیر غریب سب برابر تھے۔ وہ جو کچھ کماتے تھے اپنے عزیزوں اور غریبوں کی مدد اور قومی کاموں میں اُٹھا دیتے تھے۔ غریبوں سے کوئی فیس نہ لیتے تھے بلکہ انھیں دوائیں بھی مفت دیتے تھے۔ انھیں طبّی اور قومی خدمات کی وجہ سے ''مَسیحُ المُلک'' کے نام سے شہرت نصیب ہوئی۔

حکیم صاحب غریبوں اور ضرورت مندوں کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ کتنی ہی بیواؤں اور یتیموں کے ماہانہ وَظائف مُقرّر تھے۔ دینے کا انداز ایسا ہوتا تھا کہ ایک ہاتھ سے دیتے تو دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہوتی اور لینے والا بھی شرمندہ نہ ہوتا۔

قومی مدرسوں اور طرح طرح کے چھوٹے بڑے قومی کاموں کو بھی ان کی ذات سے مدد ملتی تھی۔ آخری زمانے میں وہ اپنا زیادہ وقت جامعہ مِلّیہ اسلامیہ کے کاموں میں لگاتے تھے۔ جامعہ کے اِخراجات کا ایک بڑا حصّہ اکثر اپنی جیب سے ادا کرتے تھے اور دیکھنے والوں کو کبھی اِس کی خبر نہ ہوتی تھی کہ جامعہ بغیر چندے اور عَطیات کے کیوں کر چلائی جا رہی

ہے۔ حکیم صاحب چونسٹھ برس کی عمر میں 19 دسمبر 1927 کو جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ آج حکیم اجمل خاں ہم میں نہیں ہیں لیکن اُن کے کارنامے رہتی دنیا تک ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔

(قاضی عبدالغفّار)

مشق

• معنی یاد کیجیے

باکمال	:	کمال والا
ذہانت	:	سوجھ بوجھ
عالَم	:	حال
حِفظ کرنا	:	زبانی یاد کرنا
کتب بینی	:	کتابیں پڑھنا
طبِّ یونانی	:	علاج کا یونانی طریقہ
شعبہ	:	محکمہ، حصّہ
املاک	:	مِلک کی جمع، جائداد
وقف کرنا	:	لوگوں کی بھلائی کے لیے اپنی جائداد دے دینا
ایثار	:	قربانی
ادنیٰ	:	معمولی
فروغ	:	ترقّی، بڑھاوا

© NCERT not to be republished

جبر	:	زور زبردستی
عدم تعاون	:	ساتھ نہ دینا
اعزاز	:	رُتبہ، عزّت
درس گاہ	:	تعلیم کی جگہ، تعلیمی ادارہ
منتقل ہونا	:	ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا
امیرِ جامعہ	:	چانسلر
اتّحاد	:	مل جل کر رہنا
مطب	:	ڈاکٹر یا حکیم کے بیٹھنے کی جگہ، کلینک
پے در پے	:	ایک کے بعد ایک، لگاتار
سراسیمہ	:	گھبرایا ہوا، ڈرا ہوا
ضبط و تحمّل	:	صبر اور برداشت
انکسار	:	خاک ساری، خود کو چھوٹا سمجھنا، عاجزی
عِزّتِ نَفْس	:	خود کی عزّت، خودداری
چیں بہ جبیں ہونا (محاورہ)	:	ناراض ہونا
ٹَس سے مَس نہ ہونا (محاورہ)	:	اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلنا
فقیرانہ طبیعت	:	سادہ طبیعت
وظائف	:	وظیفہ کی جمع، مدد کے لیے دی جانے والی رقم
مسیح الملک	:	ملک کا مسیحا، بیماروں کو اچھّا کرنے والا
عطیات	:	عطیہ کی جمع، چندہ

© NCERT not to be republished

جہانِ فانی : ختم ہونے والی دنیا

کوُچ کرنا : روانہ ہونا

• سوچیے اور بتائیے

1۔ حکیم اجمل خاں نے طبیّہ مدرسے کی ترقّی کے لیے کیا کام کیے؟

2۔ تعلیم کے بارے میں حکیم اجمل خاں کا کیا خیال تھا؟

3۔ جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے نام سے قومی درس گاہ کہاں اور کن لوگوں کی کوششوں سے قائم ہوئی تھی؟

4۔ ہندو مسلم اتّحاد کے لیے حکیم صاحب نے کیا خدمات انجام دیں؟

5۔ ریل کے سفر میں حکیم صاحب کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا؟

6۔ حکیم صاحب غریبوں کی مدد کس طرح کرتے تھے؟

© NCERT not to be republished

چلیے ذرا سنبھل کر!!

’’صبیح ! آج یہ پھول اس قدر مرجھایا ہوا کیوں ہے؟ تمھاری صباحت کیا ہوئی ؟ ہم نے تو تمھیں ہمیشہ چہکتے ہی دیکھا ہے۔ارے یہ کیا! تمھاری آنکھوں میں یہ آنسو کیسے؟‘‘ صبیح کے دوستوں نے آج اسکول میں اسے رنجیدہ دیکھ کر بے ساختہ کہا۔صبیح محوِ حیرت تھا اور کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکل رہا تھا۔وہ سب کو حیران پریشان نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

’’ کچھ تو کہو آخر بات کیا ہے؟‘‘ دوستوں نے اسے پھر چہکانے کی کوشش کی مگر یہ چاند نہ جانے غم کے کن بادلوں میں کھو گیا تھا۔سب تھک ہار کے بیٹھ رہے۔اسی دوران گھنٹہ بجا۔کلاس میں اردو کے استاد داخل ہوئے۔تدریسی فضا سازی اور مختصر تمہید و تعارف کے بعد استاد نے اعلان کیا کہ آج ہم خواجہ میر دردؔ کی غزل کا مطالعہ کریں گے۔استاد جب اس

شعر پر پہنچے۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

صبیح نے اس شعر کو بآواز بلند دہرایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بس اب تو کلاس کی فضا ہی بدل گئی۔ استاد صبیح کے قریب آئے اور اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔ سر! یہ زندگی کس قدر انمول ہے مگر ہم اسے کس بے قدری کے ساتھ ضائع کر دیتے ہیں۔ سر! اس وقت آپ نے بہت ہی عمدہ شعر پڑھا۔

اب صبیح کی آنکھوں میں صبح کی مانند چمک تھی اور چہرے پر دمک۔ اس نے اب اپنی اس کیفیت کا راز کھولنے کی کوشش کی جس نے اسے بے حال کر رکھا تھا۔ وہ گزشتہ تین دن سے اسکول نہیں آیا تھا اور آتا بھی کیسے؟ اس کے پیارے چچا جان اچانک ایک حادثے میں جان گنوا بیٹھے تھے۔ صبیح نے ہمت کر کے کچھ بتانے کی کوشش کی۔ ''میرے چچا جان

بڑے شوخ اور چنچل مزاج اور لاپروا قسم کے آدمی تھے۔ وہ کسی خطرے کی پروا نہیں کرتے تھے۔ گاڑی بہت اچھی چلاتے مگر احتیاط سے کام نہیں لیتے تھے۔ میرے والد صاحب نے انھیں کئی بار ٹوکا مگر وہ باز نہ آئے۔ بس ہنس کر ٹال دیتے۔

کئی بار ایسا اتفاق ہوا کہ ہم ان کے ساتھ کسی چوراہے پر کھڑے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہری بتی (Green Light) ہو، انھوں نے جلد بازی میں اپنی گاڑی بڑھا دی اور بس یہ جا وہ جا۔ کئی بار ان کے چالان بھی

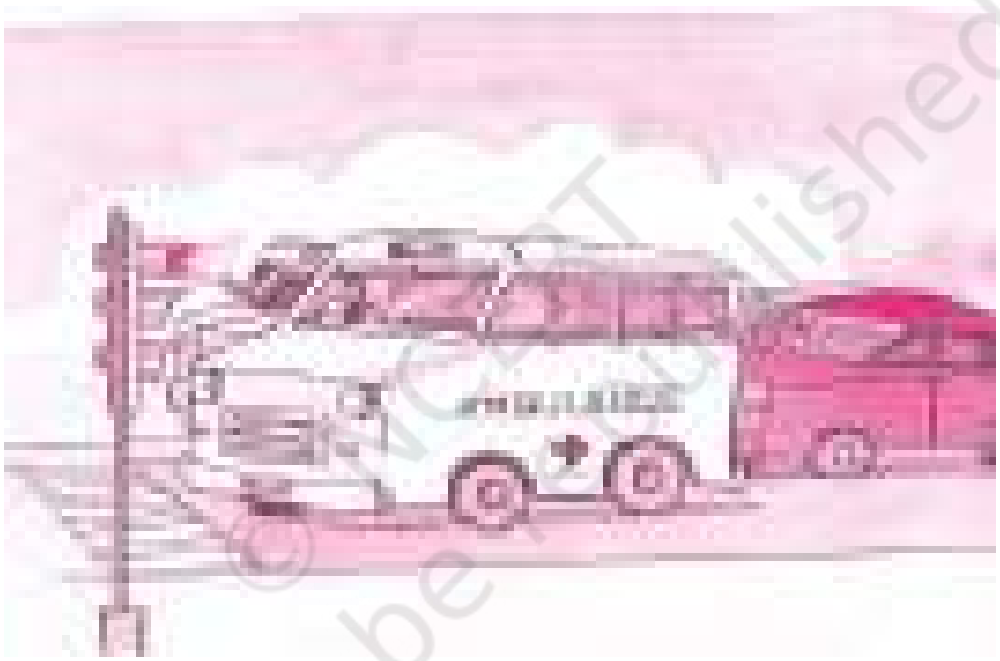

ہوئے مگر عقل نہ آئی۔ پچھلے ہفتے اچانک ایک ایسا ہی حادثہ پیش آیا۔ وہ صبح نو بجے گھر سے اپنے دفتر کے لیے نکلے۔ رات بھر بارش کی وجہ سے سڑکوں کی حالت بہت خراب تھی۔ جگہ جگہ پانی بھرا تھا۔ کوئی گڑھا یا نالا تک نظر نہیں آتا تھا۔ ہر طرف جام لگا تھا۔ اب یہاں سے کیسے نکلیں؟ خیر خدا خدا کر کے انھوں نے کئی راستے بدلے مگر ہر طرف یہی صورتِ حال تھی۔ اِدھر وہ جام میں پھنسے رہے اُدھر آفس پہنچنے کی جلدی۔ انھوں نے اپنی گاڑی کو رنگ روڈ (Ring Road) کی طرف موڑ دیا۔ پھر جلد بازی میں ایک چوراہے پر وہی غلطی کی جو وہ اکثر کیا کرتے تھے۔ مگر آج ان کی شوخی کام نہ آئی۔ دائیں جانب

سے ایک ٹرک آ رہا تھا بس ان کی گاڑی ٹرک سے ٹکرا گئی۔ نتیجہ سامنے تھا۔ دو دن تک وہ زندگی موت کی کشمکش میں رہے مگر پرسوں اپنے زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسے۔ یہ کہہ کر صبیح رونے لگا۔ کلاس کے سبھی طالب علموں اور استاد پر اس حادثے کا گہرا اثر ہوا۔ استاد نے بھی گہرے افسوس کا اظہار کیا اور طلبا کو بتایا کہ آج کی تیز رفتار زندگی، سڑکوں پر ہر طرف دوڑتی، آسمان سے باتیں کرتی گاڑیاں؛ ان سے نکلتا دھواں اور لوگوں کی جلد بازی نے ہماری زندگی کا چین و سکون ختم کر دیا ہے۔ اس کے ذمّے دار ہم خود ہیں۔ ذرا بتاؤ چوراہے پر جگہ جگہ روشنی کے یہ سگنل (Signals) کس لیے بنے ہیں؟ سرخ بتی سے پہلے ہمیں پیلی بتّی پر ہی رک جانا چاہیے۔ جب تک لال بتّی رہے ہمیں اپنی جگہ رہنا چاہیے۔ جب ہری بتی (Green Light) روشن ہو، اسی وقت آگے بڑھنا چاہیے۔ سڑک پر اگر ہم پیدل چل رہے ہوں تو دائیں بائیں کا خیال بھی ضرور رکھنا چاہیے۔ ہمیں ہمیشہ سڑک پر اپنی بائیں جانب چلنا چاہیے۔ چلتے وقت نظر اور ذہن دونوں کو چوکنّا رکھنا چاہیے۔ زیبرا کراسنگ (Zebra Crossing) کا صحیح استعمال کرنا چاہیے۔ یہ احتیاطی تدابیر ہیں۔ ہمیں ٹریفک کے قوانین (Traffic Rules) پر ہر حال میں عمل کرنا چاہیے۔

© NCERT not to be republished

تیز رفتار ترقی کے اس دور میں ہر طرح کی سہولیات موجود ہیں۔ دن بہ دن بڑھتے ٹریفک کو کنٹرول کرنے کے لیے حکومت نئی نئی سڑکیں بنواتی ہے۔ سڑکوں کو چوڑا کرتی ہے۔ فلائی اوورز (Fly Overs) بناتی ہے اور تو اور دہلی میں میٹرو ٹرین (Metro Trains) کا بھی جال بچھ گیا ہے۔ مگر یہ سب ذرائع کچھ ہی وقت میں بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں، جب سڑکوں پر موٹر گاڑیوں کی تعداد مزید بڑھ جاتی ہے۔ ہر طرف ٹریفک جام ہوتا ہے۔ یہ دیکھ کر مزید حیرت ہوتی ہے کہ نہایت قیمتی اور کشادہ ایرکنڈیشن گاڑی میں بس ایک شخص تن تنہا سفر کر رہا ہے۔ پٹرول ڈیزل کی مستقل بڑھتی قیمتوں کو دیکھیے اور گاڑیوں کی اس بڑھتی تعداد کو، ان سے نکلتے ہوئے دھویں اور آلودگی کو دیکھیے، جو نہ جانے کتنے لوگوں کو بیماریوں کی آغوش میں لے لیتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ دفتری اوقات میں صرف خصوصی گاڑیوں کا ہی انتظام ہو جن کا کام مختلف مقامات سے لوگوں کو ان کے مقررہ مقام تک پہنچانا ہو۔ حالاں کہ کچھ ایسی بسیں ہیں جنھیں چارٹیڈ بس (Charted Buses) کہا جاتا ہے مگر اس طرح کی سہولیات کو زیادہ سے زیادہ ہونا چاہیے۔ ہمیں کوشش کرنا چاہیے کہ نجی گاڑیوں کا استعمال صرف ذاتی اوقات میں اور بس ضرورت کے تحت ہی ہو۔ اس طرح زمین پر بڑھتے ہوئے بوجھ کو بھی کم کرنے میں مدد ملے گی اور معاشی نقطۂ نظر سے بھی کچھ فوائد حاصل ہوسکیں گے۔

© NCERT not to be republished

صبح کا وقت عام طور پر اسکول کے طلبا کے لیے مخصوص ہے۔ جدھر دیکھیے اسکول کے طالب علموں کا سمندر امڈتا دکھائی دیتا ہے۔ سڑکوں پر صبح کے وقت اگر عام گاڑیوں پر کسی نہ کسی طور پر روک ہوتا کہ طلبا بروقت اور پوری حفاظت کے ساتھ اسکول پہنچ سکیں۔

مختلف چوراہوں پر اکثر دستِ سوال دراز کرنے والے اور مختلف قسم کی روزمرہ کی اشیا کی فروخت کرنے والے بھی ٹریفک کے مسائل پیدا کرتے ہیں اور کبھی کبھی تو اس وجہ سے حادثے بھی پیش آتے ہیں۔ اس کے علاوہ غلط قسم کی اشیا کی فروخت کو بھی بڑھاوا ملتا ہے۔ ایک ذمّے دار شہری کے طور پر ہماری ذمّے داری ہے کہ ہم سڑکوں پر اس قسم کی نقلی اشیا کے فروخت کرنے والوں سے بچیں۔

ملک کی دولت اور جانداروں کی حفاظت بھی ہمارا فرض ہے۔ مگر سڑکوں پر مختلف قسم کے جانوروں گائے، بیل وغیرہ کو لوگ کھلا چھوڑ دیتے ہیں اور وہ بڑے اطمینان وسکون کے ساتھ سڑکوں پر دندناتے پھرتے ہیں۔ بعض حادثات ان کی وجہ سے بھی رونما ہوتے ہیں۔ ہمارے ذمّے داروں کو اس طرف بھی خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

© NCERT not to be republished

آج کی کلاس کا گھنٹہ بس استاد کی ان ہی اہم باتوں کی نذر ہو گیا۔ شعر کی تشریح تو نہ ہو سکی مگر زندگی کے بہت سے مسائل کی تشریح ضرور ہو گئی۔ طلبا نے بہت لطف لیا اور عہد کیا کہ وہ آج کی ان اہم باتوں کو یاد رکھیں گے اور اس سے یہ سبق ضرور لیں گے کہ زندگی ایک امانت ہے اور اس امانت کی جہاں تک ہو سکے حفاظت ضروری ہے۔ یہ ہماری محض ذاتی ذمّے داری ہی نہیں بلکہ اخلاقی و سماجی فرض بھی ہے۔

© NCERT not to be republished

مشق

• معنی یاد کیجیے

صبیح	:	گورا، خوب صورت
رنجیدہ	:	غم گین
صباحت	:	گوراپن
بے ساختہ	:	اچانک، بے ارادہ
محوِ حیرت	:	حیرت زدہ
فضا	:	ماحول
انمول	:	قیمتی
شوخ	:	تیز، چنچل
آغوش	:	گود، بغل
حدود	:	حد کی جمع، حدیں
دستِ سوال دراز کرنا (محاورہ)	:	مانگنے کے لیے ہاتھ بڑھانا
اشیا	:	شے کی جمع، چیزیں

• سوچیے اور بتائیے

1۔ صبیح کے دوستوں نے اسے رنجیدہ دیکھ کر کیا کہا؟

2۔ خواجہ میر دردؔ کا وہ شعر لکھیے جسے صبیح نے دہرایا؟

3۔ ٹریفک کے کن قوانین پر عمل کرنا بے حد ضروری ہے؟

4۔ بڑھتے ہوئے ٹریفک کنٹرول کے لیے حکومتِ ہند نے کیا تدابیر کی ہیں؟

5۔ نجی گاڑیوں کا استعمال صرف ذاتی اوقات میں کرنے سے کیا فائدہ حاصل ہوگا؟

© NCERT not to be republished

نوٹ

© NCERT not to be republished

نوٹ

© NCERT not to be republished